تعلیم و تربیت

Sharjeel Ahmed

اکتوبر 1993ء

ووٹ قوم کی امانت ہے۔ اس کا غلط استعمال ملک و قوم سے غداری ہے۔

53 واں سال
ساتواں شمارہ
تعلیم و تربیت
پاکستان میں سب سے زیادہ پڑھا جانے والا
بچوں کا محبوب رسالہ
چیف ایڈیٹر عبدالسلام
ایڈیٹر سعید لخت
آرٹ ڈائریکٹر محمود حسن رومی
اسسٹنٹ آرٹ ڈائریکٹر سید شوکت اعجاز
سرکولیشن اسسٹنٹ محمد بشیر راہی
مطبوعہ فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ لاہور
پبلشر: ظہیر سلام
پرنٹر عبدالسلام

پتا
ماہنامہ تعلیم و تربیت
32-، شارع بن بادیس لاہور
فون:- 6361309-6361310
6278815-6278816

سرکولیشن اور اکاؤنٹس
60- شاہراہِ قائدِ اعظم لاہور

سالانہ قیمت
ن میں (صرف رجسٹری کے ساتھ) 200/- روپے
وسطیٰ/افریقہ (ہوائی ڈاک سے) -/300 روپے
(ہوائی ڈاک سے) -/450 روپے
شرقِ بعید (ہوائی ڈاک سے) -/450 روپے

اکتوبر 1993

قیمت فی پرچہ -/9 روپے

سرورق: وَن ڈے کرکٹ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

السلامُ علیکم

ہمارے پیارے وطن پاکستان میں اس مہینے کی 6 اور 9 تاریخ کو قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات ہو رہے ہیں، جن میں مختلف سیاسی جماعتیں حصّہ لیں گی۔ جس جماعت کے کام یاب اُمیدواروں کی تعداد زیادہ ہوگی، وہی ملک پر حکومت کرے گی۔

ہر سچّے اور وطن دوست پاکستانی کا فرض ہے کہ ووٹ دیتے وقت کسی دباؤ یا لالچ میں نہ آئے، اور نہ ذات برادری کا خیال کرے۔ وہ ایسی جماعت کو ووٹ دے جو اُس کی نظر میں ملک و قوم کی سچّی خیر خواہ ہو، اور اُس کے اُمیدواروں کا دامن ہر قسم کی بُرائی سے پاک و صاف ہو۔

آپ ابھی چھوٹے ہیں۔ آپ کو ووٹ دینے کا حق حاصل نہیں، مگر آپ اپنے والدین، رشتے داروں اور محلّے داروں کو اُن کا یہ فرض یاد دلاتے رہیں۔

خدا کرے یہ انتخابات امن و امان سے گزر جائیں۔ جو سیاسی جماعت حکومت بنائے، اُس کے وزیر سچّے دل سے ملک و قوم کی خدمت کریں۔ غُربت، جہالت اور بے روز گاری دُور کریں۔ قومی خزانہ بھریں۔ اپنی جیبیں نہ بھریں۔ کہیے آمین! ثُمّ آمین!

اس شمارے میں

اداریہ — 1
وَن ڈے کرکٹ میچ (نظم) — ضیغم حیدری — 2
جوانی کا چشمہ (کہانی) — سعید لخت — 3
کالاہاری کا آخری سفر (کہانی) — سلیم احمد صدیقی — 6
والدین سے حسن سلوک — ڈاکٹر عبدالرؤف — 10
شاں ہاجا — ڈاکٹر نصیر احمد ناصر — 11
سندری غار کا راز (کہانی) — محمد یونس حسرت — 13
آیئے مسکرائیں (لطیفے) — 20
ماں باپ کی خدمت (نظم) — محمد احمد شاد — 21
چراغ (کہانی) — نیاز علی بھٹی — 22
عزم و ہمت کی داستانیں — مقبول انور داؤدی — 26
دستک (کہانی) — رضوان محمد خاں جاذب — 28
پاکستان کے پہاڑ (مضمون) — حسین حسنی — 31
آیئے دوست بنائیں — 34
سیر کو سوا سیر (کہانی) — زیب النساء حلیم — 35
حکایاتِ بوستانِ سعدی — 38
آپ کا خط ملا — 39
چٹ پٹے مسالے دار — 41
آپ بھی لکھیے — 43
داؤدی علمی آزمائش — 48
ہم فخرِ پاکستان ہیں (نظم) — ناصر زیدی — 49
ذرا سی نیکی (کہانی) — سید نظر زیدی — 50
یہ حقیقت ہے (معلومات) — 52
دلچسپ و عجیب — 53
سائنس کے کھیل — 54
ہونہار مصور — 55
عظیم مسلمان (داتا گنج بخشؒ) — معین الحق فریدکوٹی — 56

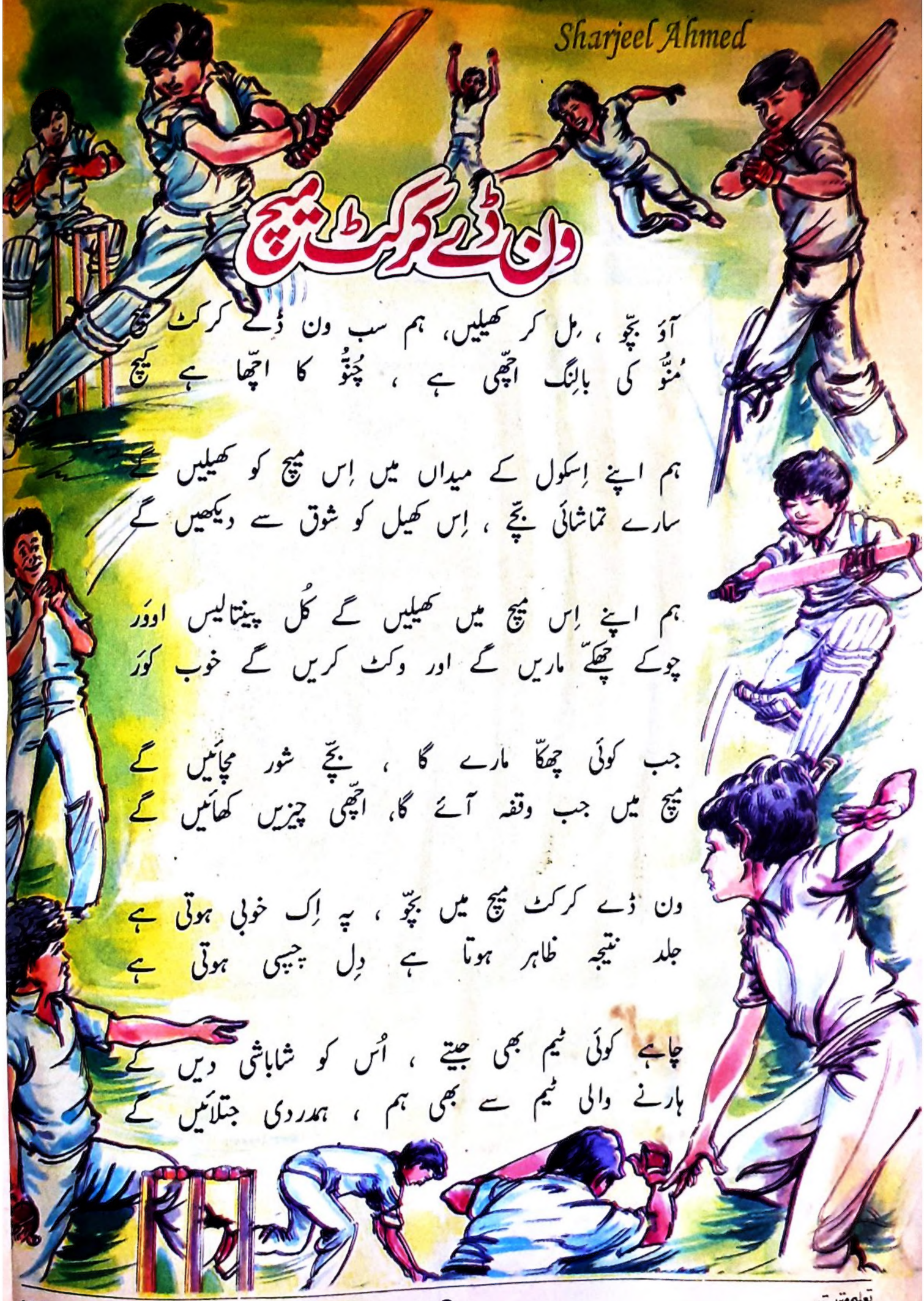

ون ڈے کرکٹ میچ

آؤ بچّو ، مل کر کھیلیں، ہم سب ون ڈے کرکٹ میچ
مُنّو کی بالنگ اچھّی ہے ، چُنّو کا اچھّا ہے کیچ

ہم اپنے اِسکول کے میداں میں اِس میچ کو کھیلیں گے
سارے تماشائی بچّے ، اِس کھیل کو شوق سے دیکھیں گے

ہم اپنے اِس میچ میں کھیلیں گے کُل پینتالیس اووَر
چوکے چھکّے ماریں گے اور وکٹ کریں گے خوب کوَر

جب کوئی چھکّا مارے گا ، بچّے شور مچائیں گے
میچ میں جب وقفہ آئے گا، اچھّی چیزیں کھائیں گے

ون ڈے کرکٹ میچ میں بچّو ، یہ اِک خوبی ہوتی ہے
جلد نتیجہ ظاہر ہوتا ہے دِل چسپی ہوتی ہے

چاہے کوئی ٹیم بھی جیتے ، اُس کو شاباشی دیں گے
ہارنے والی ٹیم سے بھی ہم ، ہمدردی جتلائیں گے

جاپانی لوک کہانی

جوانی کا چشمہ

سعید لخت

اُس ملک میں جسے ہم جاپان اور جاپانی نِپن کہتے ہیں، کسی زمانے ایک بوڑھا لکڑہارا، یوشیدا، اپنی بیوی، فومی، کے ساتھ رہتا تھا۔ دونوں میاں بیوی ایک چھوٹی سی جھونپڑی میں زندگی کے آخری دن گزار رہے تھے۔ بچّے جوان ہو گئے تھے اور اُنھوں نے اپنے الگ گھر بسا لیے تھے۔

شام کو، دن بھر کے کام کاج کے بعد، دونوں بُڑھیا بُڈّھے چولھے کے پاس بیٹھ کر اُن سُہانے دِنوں کو یاد کر کے ٹھنڈی آہیں بھرتے جب وہ جوان تھے۔ اُس وقت یوشیدا کی کمر سرو کی طرح سیدھی تھی اور بازوؤں میں اِتنی طاقت تھی کہ وہ جنگل کا بڑے سے بڑا درخت دو تین گھنٹوں میں گرا لیتا تھا۔ فومی، ہرنی کی طرح، پہاڑیوں پر چوکڑیاں بھرتی پھرتی تھی۔ اُس کی جلد پکے ہوئے آڑو کے چھلکے کی طرح نرم و مُلائم اور بال کالی گھٹا کی طرح گھنے اور سیاہ تھے۔

لیکن افسوس! اب سب کچھ بدل چکا تھا۔ بُڑھاپے کی دیمک اُن کی تمام خوب صورتی، تمام طاقت کو چاٹ گئی تھی۔ بدن کا گوشت گھُل گیا تھا۔ کھال لٹک گئی تھی۔ چہرے پر بے شمار سلوٹیں پڑ گئی تھیں۔ چندیا پر ایک بال بھی نہ رہا تھا، اور کمر کمان کی طرح دوہری ہو گئی تھی۔

یوشیدا حسرت سے کہتا "اری فومی! یہ ہم کیا بن گئے ہیں؟"

اور فومی بُرا سا مُنہ بنا کر کہتی "چُوسی ہُوئی گنڈیری۔"

اِنسان جب تک زندہ رہتا ہے، اُسے پیٹ پالنے کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا ہی پڑتا ہے۔ یوشیدا اب بھی روز صبح کو جنگل میں جاتا، اور وہاں سے لکڑیاں لا کر گلی کوچوں میں بیچتا۔ لیکن اب اُس کے بازوؤں میں اِتنی سکت نہ تھی کہ بڑے درخت کاٹتا۔ بس چھوٹے موٹے درخت اور جھاڑیاں کاٹ کر گزارا کر رہا تھا۔ فومی بھی اِتنی کم زور ہو گئی تھی کہ اُس سے دو روٹیاں بھی مُشکل سے پکتی تھیں۔ کبھی کبھی تو یُوں ہوتا کہ ہنڈیا میں ڈوئی چلاتے چلاتے اُونگھ جاتی اور ساری دال جل جاتی۔ اب اُس کی جھونپڑی بھی پہلے جیسی صاف سُتھری نہ رہتی تھی۔

ایک دن دونوں بُڑھیا بُڈّھے سونے کے لیے لیٹے تو اُنھیں جوانی بُری طرح یاد آئی۔ وہ ہاتھ جوڑ کر گھٹنوں کے بَل

جھک گئے اور رو رو کر دعا مانگنے لگے "اے پروردگار! تو جو چاہے کر سکتا ہے۔ تیرے لیے کوئی چیز بھی ناممکن نہیں۔ اے پروردگار! ہمیں پھر سے جوان کر دے تاکہ ہم آرام سے زندگی بسر کر سکیں۔ اِس بڑھاپے نے تو ہمیں اپاہج کر کے رکھ دیا ہے"۔ اِسی طرح روتے دھوتے، دُعا مانگتے سو گئے۔

دوسرے دن، صبح کے وقت، یوشیدا کو نیند میں ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی اُس سے کہہ رہا ہو "جلدی اُٹھ! جنگل میں جا۔ وہاں خوش قسمتی تیرا اِنتظار کر رہی ہے۔"

وہ آنکھیں ملتا ہوا اُٹھا، ہولے سے جھونپڑی کا دروازہ کھولا اور باہر نکل گیا۔ جب وہ جنگل میں پہنچا تو ایسا لگا جیسے بہار آ گئی ہو۔ ہرے بھرے درخت خوشی سے جھوم رہے تھے۔ اُن کی شاخوں پر رنگ برنگ پرندے میٹھی میٹھی بولیاں بول رہے تھے۔ ذرا آگے بڑھا تو کیا دیکھتا ہے کہ درختوں کے ایک جُھنڈ میں، ایک چھوٹی سی پہاڑی میں سے ایک چشمہ بہ رہا ہے۔ یہ پہاڑی چشمہ اُس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اُس کا پانی اِتنا صاف شفّاف تھا کہ وہ اپنے آپ کو روک نہ سکا، ایک دم نیچے جُھکا، چُلّو میں پانی بھرا اور ایک ہی گھونٹ میں پی گیا۔

پانی پیتے ہی اُسے یوں لگا جیسے اُس کے بدن میں نئی زندگی دوڑ گئی ہو۔ جُھکی ہوئی کمر ایک دم سیدھی ہو گئی۔ جسم گوشت سے بھر گیا۔ کھال تن گئی۔ اُس نے چشمے کے پانی میں اپنی شکل دیکھی تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ اُس کے پچکے ہوئے گال گوشت سے بھر گئے تھے، اور اُن پر جوانی کی سُرخی دوڑ رہی تھی۔ وہ آنکھیں جو اندر کو دھنس گئی تھیں، اب اُبھر آئی تھیں اور ستاروں کی طرح چمک رہی تھیں۔ اُس نے سر پر ہاتھ مارا تو وہ بھی سیاہ گھنے بالوں سے ڈھکا ہُوا تھا۔ اُس نے اچھل کر زور سے نعرہ مارا "یا ہُو!" اور سرپٹ بگ ٹٹ گھر کی طرف بھاگا۔

فومی ابھی ابھی سو کر اُٹھی تھی اور مُنہ ہاتھ دھونے جا رہی تھی کہ یوشیدا قلانچیں بھرتا ہوا اندر داخل ہُوا۔ فومی اُسے دیکھ کر حیران رہ گئی۔ بولی "ارے! تو یوشیدا ہی ہے یا کوئی اور ہے؟"

یوشیدا بولا "اری بے وقوف! غور سے دیکھ۔ میں تیرا یوشیدا ہی ہوں۔ میں جوان ہو گیا ہوں۔ خدا نے ہماری سُن لی ہے۔"

"ہماری کہاں سُنی" فومی اُداس ہو کر بولی "تیری سُن لی۔ میں تو ویسی کی ویسی ہی ہُوں۔"

یوشیدا نے کہا "گھبرا مت۔ جنگل میں جا۔ وہاں درختوں کے ایک جُھنڈ میں جوانی کا چشمہ بہ رہا ہے۔ اُس کا پانی پی۔ تو بھی جوان ہو جائے گی۔"

"لے، ابھی جاتی ہوں۔ تو یہیں میرا اِنتظار کر" فومی نے کہا اور لُڑھکتی پُڑھکتی جنگل کی طرف چل دی۔

جب وہ جنگل میں درختوں کے اُس جُھنڈ کے پاس پہنچی جس کا پتا یوشیدا نے بتایا تھا تو وہاں سچ مُچ پانی کا ایک چشمہ بہ رہا تھا۔ وہ چشمے کے کنارے بیٹھ گئی اور چُلّو بھر بھر کے پانی پینے لگی۔

اُدھر یوشیدا، جھونپڑی میں بیٹھا، بڑی بے صبری سے ایک ایک گھڑی گِن رہا تھا۔ ایک گھنٹا گزرا، دو گھنٹے گزرے اور

جب تین گھنٹے گزر گئے تو وہ گھبرا گیا۔ سوچنے لگا، شاید بڑھیا کو چشمہ مِلا نہیں۔ مجھے اُس کے ساتھ جانا چاہیے تھا۔ یا ہو سکتا ہے وہ جوان ہو کر جنگل میں ہرنوں کے پیچھے دوڑتی پھر رہی ہو۔ چل کر دیکھوں تو، مُعاملہ کیا ہے!

وہ دوڑتا ہوا جنگل میں پہنچا تو کسی بچّے کے رونے کی آواز آئی "ہُوا آں آں۔ ہُوا آں آں۔" اُسے بڑا چنبھا ہُوا۔ آگے بڑھا اور چشمے کے پاس پہنچا تو کیا دیکھتا ہے کہ ایک ننھّی سی بچّی زمین پر بیٹھی زور زور سے رو رہی ہے۔ وہ سب کچھ سمجھ گیا۔ لالچی فومی ایک چُلّو پانی کے بجائے کئی چُلّو پی گئی تھی۔

اب وہ اُسے جنگل میں چھوڑ کر تو جا سکتا نہیں تھا۔ اُس نے اُسے گود میں اُٹھایا اور گھر کی طرف چل دیا۔ بچّی بِلک بِلک کر روئے چلی جا رہی تھی "ہُوا آں آں۔ ہُوا آں آں۔" یوشیدا نے گھر آ کر اُسے چٹائی پر بٹھا دیا اور بولا "اب میں تیرے لیے دُودھ کہاں سے لاؤں؟ دن میں کم سے کم ایک کِلو تو پی ہی جائے گی۔ اِتنا دُودھ میں کس طرح خریدوں گا۔"

یہ کہہ کر وہ گھٹنوں کے بَل جُھک گیا اور سر جُھکا کر، ہاتھ جوڑ کر بولا "اے پروردگار! ہمیں مُعاف کر دے۔ ہم سے بہت بڑی غلطی ہوئی۔ ہم نے تجھ سے وہ چیز مانگی جو نہیں مانگنی چاہیے تھی۔ ہمیں جوانی نہیں چاہیے۔ تُو ہمیں ہمارا بُڑھاپا واپس لَوٹا دے۔" اُس نے دونوں ہاتھوں میں سر تھام لیا اور اِسی طرح بیٹھے بیٹھے سو گیا۔

جب اُس کی آنکھ کُھلی اور اُس نے اپنے ہاتھوں کو دیکھا تو اُن کی کھال لٹکی ہوئی تھی۔ مُنہ میں دانت بھی نہ تھے، اور سر پر بھی کوئی بال نہ تھا۔ وہ بوڑھا ہو گیا تھا۔ اُس نے اُس چٹائی کی طرف دیکھا جس پر بچّی کو بٹھایا تھا۔ بچّی غائب تھی اور اُس کی جگہ فومی لیٹی ہوئی تھی۔ وہ بھی بوڑھی ہو گئی تھی۔ یوشیدا نے اُسے ہِلایا اور پھر مسکرا کر بولا:

"فومی، سُنو! پودوں میں کلیاں آتی ہیں۔ کلیاں پھُول بنتی ہیں، اور پھُول چند دن بعد مُرجھا کر گِر جاتے ہیں۔ اِسی طرح اِنسان اور حیوان بچّے سے جوان ہوتے ہیں اور پھر بوڑھے ہو کر مرجاتے ہیں۔ یہ قُدرت کا اٹل قانُون ہے۔ اِسے بدلنے کی خواہش کرنا بے وقوفی ہے۔"

"اور یہ بے وقوفی ہم نے کی، اور اِس کی سزا بھگتی" فومی نے سر جُھکا کر کہا۔

Sharjeel Ahmed

سلیم احمد صدیقی

کالاہاری کا آخری سفر

سخت گرمی کا موسم تھا۔ آسمان سے آگ برس رہی تھی اور زمین جھلس رہی تھی۔ سورج کی بے رحم کرنیں مسلسل ہمارے ٹرک کے کیبن پر پڑ رہی تھیں اور کیبن تنور بنا ہوا تھا۔ ایسے میں ہم جنوبی افریقہ کے ریگستان کالاہاری میں سفر کر رہے تھے۔ ٹرک کے سامنے پھیلا ہوا کچا راستہ اِس طرح رینگتا، بل کھاتا دکھائی دے رہا تھا جیسے کوئی رِبَن پڑا ہو۔ اِس ریگستان میں یا تو کانٹے دار جھاڑیاں ہیں یا پھر ریت ہی ریت۔

اچانک کچھ فاصلے پر ایک صحرائی ہرن نمودار ہوا۔ پھر دوسرا اور پھر تیسرا۔ یہ ہرن ہلکے بھورے رنگ کے تھے اور اُن کے جسم پر کہیں کہیں سفید دھاریاں تھیں۔ ہمارے نزدیک جاتے ہی وہ پُھرتی سے قریبی جھاڑیوں میں گُم ہو گئے۔ دو ایک جنگلی خرگوش بھی اِدھر اُدھر جاتے ہوئے نظر آئے۔ چند ریگستانی بگلے بھی دکھائی دیے ـــــ اور ایک جگہ تو عین راستے کے دائیں جانب، ایک لنگور اپنے بچّے کو گود میں لیے بیٹھا تھا۔ ہمارے ٹرک سے وہ ذرا بھی خوف زدہ نہ ہوا اور اُسی طرح بیٹھا رہا۔ ہم نے سفر پر روانگی سے قبل سُنا تھا کہ اِس بار پانی کی کمی کے باعث زیادہ تر جانور دوسرے علاقوں میں چلے گئے ہیں، لیکن لگتا تھا کہ یہ بات صحیح نہیں کیوں کہ سفر کے دوران میں ہمیں ہر قسم کا جانور نظر آ رہا تھا۔

ابھی میں اِس بات پر غور کر ہی رہا تھا کہ کیبن کی پچھلی کھڑکی پر دستک ہوئی۔ میں نے ٹرک روکا اور پیچھے مُڑ کر پوچھا "کیا بات ہے، موس؟"

موس میرا خان ساماں بھی تھا اور بیرا بھی۔ وہ ہر کام بڑی آسانی سے کر لیتا تھا۔ آپ سوچ رہے ہوں گے کہ میں اور موس کالاہاری میں کیا کر رہے تھے؟ بات یہ ہے کہ میں ان دنوں ٹیوب ویل اِنسپکٹر تھا اور مجھے پاکستان سے جنوبی افریقہ گئے دُوسرا سال تھا۔ میری ملازمت بھی عجیب تھی۔ سردیوں سردیوں تو آرام رہتا تھا۔ "کیپے روز" کے ہیڈ کوارٹر میں مزے

سے گزرتی تھی۔ البتہ گرمیوں بھر کالاہاری میں ایک بستی سے دوسری اور دوسری سے تیسری بستی میں جانا پڑتا تھا کہ اگر کسی بستی کا ٹیوب ویل خراب ہو گیا ہو تو اُسے ٹھیک کر دوں۔ اِن چھوٹی چھوٹی ریگستانی بستیوں میں لگے کنوؤں ہی پر یہاں کے اِنسانوں اور جانوروں کی زندگی کا دار و مدار ہے۔ میں اِس کام کی تربیت ایک افریقی اِنسپکٹر سے لے چکا تھا۔ کام اِتنا زیادہ نہ تھا لیکن گرمی میں مُسلسل سفر کرنا پڑتا تھا۔ اِس بار میں اور میرا افریقی ملازِم موس اِس طویل سفر پر نکلے ہوئے تھے۔

"مورینا" موس نے مجھے مُخاطب کیا۔ نہ جانے کیوں وہ مجھے مورینا کہتا تھا "کیوں نہ ہم کھانا کھالیں؟"

بھوک مجھے بھی لگی تھی اور اِس بہانے تھوڑا سا ستانا بھی چاہتا تھا۔ میں نے کہا "ٹھیک ہے، موس۔ مگر ذرا ٹھہر جاؤ۔ میں ٹرک کو کسی بڑی جھاڑی کے سائے میں کھڑا کر دوں۔"

چند منٹ بعد موس نے ایک جھاڑی کے سائے میں دستر خوان بچھایا اور ہم مزے مزے سے کھانا کھانے لگے۔ ٹھنڈا پانی ہم اپنے ٹرک کی ٹینکی میں لے کر چلے تھے۔ یہ ٹینکی ایک بہت بڑا فرج تھی جو ٹرک کے اِنجن سے چلتا رہتا تھا اور ہمیں تمام راستے ٹھنڈا پانی ملتا رہتا تھا۔ کھانا کھا کر اور ٹھنڈا پانی پی کر میری آنکھیں بند ہونے لگیں "میں نے کہا اچھا موس، تم بھی ذرا کمر سیدھی کر لو۔ تھوڑی دیر بعد چلیں گے۔"

"ٹھیک ہے، مورینا" موس نے کہا "مجھے نیند تو نہیں آ رہی لیکن کمر سیدھی کر لیتا ہوں۔"

ابھی میری آنکھ لگے مشکل سے چند مِنٹ گزرے ہوں گے کہ آنکھ کُھل گئی۔ مجھے اپنے پیٹ پر بوجھ کا اِحساس ہو رہا تھا اور یہ بوجھ رفتہ رفتہ ہِل رہا تھا۔ یعنی کوئی بھاری چیز میرے پیٹ پر چل رہی تھی۔ اچانک میری چھٹی حِس نے مجھ سے کہا کہ ہِلنا نہیں۔ میں بے حِس و حرکت لیٹا رہا۔ موس سے دھیمے سے کہا "ہِلنا نہیں، مورینا!۔ یہ ممبا ہے!"

میرا کلیجا اُچھل کر حلق میں آ گیا اور سارا جسم پسینے میں شرابور ہو گیا۔ میں جانتا تھا کہ ممبا افریقہ کا ایک بہت زہریلا اژدہا ہے۔ اگر یہ کسی کو کاٹ لے تو چار مِنٹ کے اندر اندر وہ مر جاتا ہے۔ اِس کے زہر کا تِریاق یعنی عِلاج ہمارے ٹرک میں موجود تھا لیکن اگر وہ مجھے ڈس لیتا تو چار منٹ تو ٹرک پر چڑھنے اُترنے اور دوا لانے ہی میں گزر جاتے۔ اِس صورت میں میری موت یقینی تھی۔

"ہلنا نہیں، مورینا!" موس کی دھیمی سی آواز پھر آئی۔

میں نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو ہلنے سے روکے رکھا تھا کیوں کہ ذرا بھی ہلتا تو ممبا مجھے ڈس لیتا۔ بے حرکت لیٹے رہنے سے وہ مجھے کوئی بے جان چیز سمجھ کر چلا جاتا اور میں بچ جاتا۔

میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا اور لگتا تھا کہ پسلیاں توڑ کر باہر نکل آئے گا۔ ممبا چند لمحے کوُر کا، لیکن یہ چند لمحے مجھے بہت لمبے لگے اور پھر اُس نے آہستہ آہستہ سرکنا شروع کر دیا۔ اب وہ میرے پیٹ پر سے گزر کر سینے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ گویا موت لحہ بہ لحہ نزدیک آ رہی تھی۔ میں نے دل ہی دل میں دُعا مانگی کہ اے اللہ! میری جان بچا لے۔ ٹھنڈا پسینا میری پیشانی پر رِینگ رہا تھا اور جی چاہ رہا تھا کہ میں اُسے اُنگلیوں سے پونچھ دوں، لیکن پھر موس کی بات یاد آ گئی کہ ہلنا نہیں، کیوں کہ اُس وقت ذرا سی حرکت بھی مجھے موت کے مُنہ میں لے جا سکتی تھی۔

اب ممبا میرے سینے پر سے ہو کر گردن کی جانِب بڑھ رہا تھا۔ میں دَم سادھے لیٹا رہا۔ اب وہ میری گردن پر سے گزر رہا تھا اور میں اُس کی لجلجی جِلد اپنی گردن پر محسوس کر رہا تھا کہ اچانک موس نے ایک زور دار چھلانگ لگائی، اژدھے کو دُم سے پکڑ کر زور سے جھٹکا دیا اور اِس کے ساتھ ہی کلائی کے

ایک زبردست وار سے اُس کی گردن توڑ دی۔ اب ممبا زمین پر پڑا تڑپ رہا تھا۔ چند منٹوں ہی میں وہ ٹھنڈا ہو گیا۔

اِس کے بعد ہمارے مزید سونے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ دس منٹ کے اندر اندر ہم ٹرک میں سوار ہو چکے تھے اور ٹرک فراٹے بھرنے لگا تھا۔ ہم لیسوتو کی جانب رواں دواں تھے۔

صحرائی سفر کوئی آسان سفر نہیں ہوتا۔ آپ ٹرک پر لاہور سے کراچی جا رہے ہوں تو پچاس میل فی گھنٹا کیا، ساٹھ میل بھی کبھی کبھار چلا لیتے ہیں۔ لیکن یہاں کالاہاری میں تو ٹرک کی رفتار تیس میل سے زیادہ نہیں بڑھتی۔

اِس خوف ناک واقعے کے بعد ہم مُسلسل چلتے رہے، چلتے رہے اور شام کے چھ بجے ہم نے ایک ویرانے میں کیمپ لگایا۔ ہم ایک دو گھنٹے میں لیسوتو تو نہیں پہنچ سکتے تھے۔ کھانا کھا کر ہم نے بستر بچھائے اور اپنے چاروں جانب جھاڑ جھنکاڑ جمع کر کے آگ لگا دی تاکہ جنگلی جانور ہمارے قریب نہ آئیں۔ موس کا کہنا تھا کہ جوں ہی آگ ختم ہونے والی ہو گی، اُس کی چھٹی حِس اُسے جگا دے گی اور وہ آگ میں مزید جھاڑ جھنکاڑ ڈال کر اُسے مُسلسل روشن رکھے گا۔

دوسرے دن نُور کے تڑکے ہم نے چائے پی اور ٹرک پر سوار ہو کر چل پڑے۔ آج دوپہر تک ہمیں لیسوتو تو پہنچ جانا تھا۔ لیکن مجھے یاد آیا کہ راستے میں دو اور گاؤں بھی پڑتے ہیں: سانے اور ہکنی۔ دس بجے ہم سانے پہنچ گئے۔ ہم نے اُس کے ٹیوب ویلوں کا مُعاینہ کیا۔ گیارہ بجے ہم ہکنی پہنچے جہاں ٹیوب ویل کے قریب ہی ہمیں ایک ہرن کا ڈھانچا پڑا ملا جس سے ہم سمجھ گئے کہ دو تین دن سے کُنواں خراب ہے۔ وہاں چند گھر تھے جو سارے کے سارے خالی تھے۔ اِن گھروں کے لوگ پانی نہ ملنے کی وجہ سے کسی اور بستی میں چلے گئے تھے۔

ہکنی کا ٹیوب ویل بہت خراب تھا اور اُس کے لیے کیسے رونز سے دو ایک پُرزے لانا تھے۔ چُناں چہ ہم اب لیسوتو کی جانب روانہ ہونے کی تیاری کرنے لگے۔ ابھی ہم ٹرک کے کیبن میں نہ بیٹھے تھے کہ سامنے سے ایک افریقی ہرن "کودو" قلانچیں بھرتا ہوا آیا۔ اِس کے سینگ بہت قیمتی ہوتے ہیں۔ وہ پیاسا معلوم ہوتا تھا۔ میں نے سوچا کہ اِسے پانی دُوں۔ ابھی میں پانی لانے کے لیے ٹرک کی طرف بڑھا ہی تھا کہ ایک جانب سے چند جنگلی کُتّے دوڑتے ہوئے آئے اور اُنہوں نے ہرن پر حملہ کر دیا۔

اب ہرن آگے آگے بھاگ رہا تھا اور جنگلی کُتّے اُس کے پیچھے پیچھے۔ آناً فاناً کُتّوں نے ہرن کو پکڑ لیا اور زندہ ہی کو نوچ نوچ کر کھانے لگے۔

معصوم ہرن کے چیتھڑے اُڑتے دیکھ کر میری آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ میں نے رائفل کندھے سے اُتاری اور کُتّوں پر گولیاں برسانے لگا۔ ایک لمحے کو کتّے ساکت سے ہو گئے، جیسے اُن کی سمجھ میں نہ آیا ہو کہ یہ کیا ہو گیا۔ اِس کے بعد اُنہوں نے خوں خوار آنکھوں سے مجھے گھورا، اور مجھے یوں لگا جیسے وہ مجھ پر حملہ کرنے والے ہیں۔ لیکن اگلے ہی لمحے وہ پھر مرے ہوئے ہرن کی تِکّا بوٹی کرنے لگے۔

میں دوڑ کر ٹرک پر چڑھ گیا۔ موس مجھ سے پہلے ہی چڑھ چُکا تھا۔ میں نے جلدی سے ٹرک اِسٹارٹ کیا اور اُسے کتّوں کے اُوپر چڑھا دیا۔ وہ ٹرک کے دائیں بائیں ہو کر بھونکنے اور اُچھلنے کُودنے لگے۔ میں چاہتا تھا کہ اُن کو ٹرک تلے پیس ڈالوں کیوں کہ مجھے اُس معصوم ہرن پر ترس آ رہا تھا۔

جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، وہ سات آٹھ کُتّے تھے۔ اُن میں سے تین چار مر گئے اور باقی بچ کر ریگستانی جھاڑیوں میں گُم ہو گئے۔

سہ پہر کے وقت ہم لیسوتو تو پہنچ گئے۔ وہاں کا ٹیوب ویل بھی خراب تھا لیکن بستی کے لوگ موجود تھے کیوں کہ ٹیوب ویل صرف ایک دن پہلے ہی خراب ہُوا تھا۔

میں نے شام تک کُنوئیں کی مشینری ٹھیک کر دی۔ اِس خوشی میں گاؤں کے لوگوں نے شام کو میری زور دار دعوت کی۔ دعوت کے بعد تحفوں کا تبادلہ ہُوا۔ میں نے اُن لوگوں کو بسکٹوں کے ڈبے دیے اور اُنہوں نے مجھے خوب صورت تیر کمان۔

رات کو ہم نے گاؤں کے باہر کیمپ لگایا اور میں بستر پر لیٹ

کر ماؤتھ آرگن بجانے لگا۔ یکایک موس نے مجھے خاموش ہونے کا اِشارہ کیا اور بولا "سُنو! سُنو!" میں نے کان لگائے تو کچھ دُور "ہووہ، ـــــ ہوووو ـــــ ہو ـــــ ہوووو!" کی آوازیں سُنائی دیں۔

میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ یہ جنگلی کُتّوں کی آوازیں تھیں! میں نے جھٹ رائفل ہاتھ میں پکڑ لی۔ موس کے چہرے پر بھی خوف کی پرچھائیاں ناچ رہی تھیں۔

ذرا دیر بعد آوازیں ہمارے نزدیک آگئیں لیکن پھر حیرت ناک طور پر بند ہوگئیں۔ "اوہ!" موس نے گہرا سانس لیا اور اس کے چہرے پر پھر سے اِطمینان واپس لوٹ آیا۔ لیکن میں نے رائفل ہاتھ سے نہ رکھی اور سوچنے لگا کہ کیوں نہ رات ٹرک کے کیبن میں گزاری جائے۔ بے شک وہاں گرمی ہوگی لیکن اِس جان لیوا خوف سے تو نجات مل جائے گی۔

میں نے موس سے کہا "موس، کیوں نہ ہم......"

اوہ! میرے خدا! نہ جانے کیا ہُوا۔ اُسی وقت کوئی بلا پورے زور سے میرے چہرے پر حملہ آور ہوئی اور اُس بلا کے پنجوں سے میرا چہرہ زخمی ہوکر سُلگنے لگا۔ میں نے رائفل چلانے کی کوشش کی تو ایک اور بلا میرے رائفل والے ہاتھ پر جھپٹی۔

اُف! اب میری سمجھ میں آیا کہ یہ وہ خوف ناک جنگلی کُتّے تھے جن کے ساتھیوں کو میں نے ٹرک سے کچل کر مار دیا تھا۔ وقت اچانک رائفل چلی اور میں بے ہوش ہوگیا!

جب مجھے ہوش آیا تو میرے اِرد گرد تین کُتّے مرے پڑے تھے اور میرا بدن زخموں سے نڈھال ہو رہا تھا۔ موس نے مجھے بتایا "یہ وہی تین کُتّے تھے جو بچ کر بھاگ گئے تھے۔ میں نے اِن جنگلی کتّوں کے اِنتقام کے خوف ناک قصّے سُنے تھے لیکن مجھے یہ توقّع نہ تھی کہ وہ اِتنی دُور آکر ہم پر حملہ کریں گے۔ آپ کی گولی تو ہوا میں ضائع ہوگئی تھی اور آپ بے ہوش ہوگئے تھے۔ اِس کے بعد میں نے رائفل سنبھالی۔ لیکن اِن کُتّوں کا مارنا تھا جان جوکھوں کا کام۔ وہ زخمی ہوکر بھی ہم پر جھپٹ رہے تھے۔"

"ہاں، موس۔ جنگلی کُتّوں کے اِنتقام کی کہانیاں میں نے بھی سُنی ہیں، لیکن میں اِن کہانیوں کو جھوٹ ہی سمجھتا تھا۔ وہ تو خدا کا شکر ہے کہ اُس نے تمھیں حوصلہ اور جُرأت بخشی اور تم نے مجھے اِس خوف ناک موت سے بچالیا" میں نے کہا۔

اگلے دن "کیسے روز" کے صدر دفتر پہنچ کر میں نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اِس مُلازمت سے اِستعفا دے دیا اور پاکستان واپس آگیا۔

والدین سے حسنِ سلوک

اِس شمارے میں بچّوں کے لیے درسِ قرآن کا موضوع ہے: والدین سے حسنِ سلوک۔

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ
بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
وَوَصَّیْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَیْہِ حُسْنًا

یہ قرآنی جُملہ سُورۃ العنکبوت کی آیت نمبر آٹھ کے ابتدائی چار الفاظ ہیں۔ اِن عربی الفاظ کے معانی یہ ہیں:
وصی = تاکید کرنا، ہدایت کرنا۔ اِنسان = انسان، آدمی۔ والدیہ = (اپنے) والدین۔ حُسن = عُمدگی، خوبصورتی، حُسنِ سلوک۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ "ہم نے انسان کو اپنے والدین سے حُسنِ سلوک کی تاکید کی ہے۔"

والدین سے اچھا سلوک ہر نیک اور سمجھ دار بچّے کی سب سے بڑی سعادت ہے۔ یہ موضوع اِس قدر اہم ہے کہ اِسے قرآنِ حکیم میں کئی جگہوں پر دُہرایا گیا ہے۔ مثلاً دیکھیے سُورۃ 17، آیات 23 اور 24 - سُورۃ 31 آیت 15 - سورۃ 46 آیت 15 -

بچّوں کی پرورش، دیکھ بھال اور تعلیم و ترقّی کے لیے ماں باپ کیا کچھ نہیں کرتے۔ زندگی کا کوئی لمحہ ایسا نہیں آتا جب وہ اپنی اولاد کی بہتری کے لیے سوچ بچار اور کام کاج میں مصروف نہ رہتے ہوں۔ بعض دفعہ تو اُن کے لیے جان تک کی بازی بھی لگا دیتے ہیں۔

ہر ایک سے اچھا سلوک ویسے بھی بہت اچھّی عادت ہے۔ اِس سے انسان کی سیرت و کردار سنوَرتے ہیں۔ مگر اچھے سلوک کی بہترین قسم والدین سے اچھّا برتاؤ ہے۔ والدین سے عُمدہ سلوک کرنے والے بچّے زندگی میں ہمیشہ پھلتے پھُولتے ہیں۔ اِس کے برعکس ایسے بدنصیب بچّے جو والدین کا مناسب اِحترام نہیں کرتے یا اُن سے تلخ کلامی سے پیش آتے ہیں، کبھی بھی سُکھ چین کی زندگی سے لُطف اندوز نہیں ہوتے۔

سُنہری چڑیا
شاہل باجا

ڈاکٹر نصیر احمد ناصر

سُنہری چڑیا نے کہا:

پیارے بچّو! آج میں آپ کو ایک بڑی ہی دلچسپ کہانی سُناتی ہوں۔ یہ کہانی "شاہل باجا" کی ہے۔ یہ کیسا باجا تھا؟ ابھی آپ کو معلوم ہو جائے گا۔ برِ صغیر پاک و ہند میں آزادی سے پہلے بڑے بڑے راجے مہاراجے اور نواب ہوتے تھے۔ اُن میں سے اکثر موسیقی یعنی گانا بجانا سُننے کے شوقین تھے۔ اُن کے دربار میں نامور اور باکمال گویّے اور سازندے ہوتے تھے۔ راتوں کو گانے بجانے کی محفلیں جمتی تھیں۔ راجا، شہزادے، شہزادیاں اور درباری موسیقی سے لُطف اندوز ہوتے تھے۔

گوالیار کے راجا کی ریاست میں ایک خاندان رہتا تھا جس نے فنِ موسیقی میں بڑا نام پایا تھا۔ علم ہو یا ہُنر و فن اُس میں کمال حاصل کرنے کے لیے سخت ریاضت اور لگن کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ

محنتی اور جفاکش اِنسان ہی دُنیا میں باکمال اور نامور ہوتے ہیں۔

گویّوں کے اِس مشہور خاندان میں ایک ایسا بچّہ پیدا ہوا، جسے علم سے لگاؤ تھا نہ فنِ موسیقی سے۔ وہ پرلے درجے کا کاہل اور نکمّا تھا۔ اُس کے بزرگوں نے اُسے بہت سمجھایا کہ کچھ سیکھ لو، ورنہ بڑے ہو کر پچھتاؤ گے؟ لیکن اُس نے ایک نہ سُنی۔ اُس لڑکے کا نام کمال دین تھا۔ اُس پر یہ مثال پھبتی تھی کہ

پڑھے نہ لکھے نام محمّد فاضل

آوارہ گردی اور بُرے لوگوں کی صحبت میں وقت اور عُمر ضائع کرنا اُس کی عادت بن چکی تھی۔ موسیقی دانوں کی زبان میں وہ کوڑھ مغز تھا۔ یعنی وہ سُر اور تال کچھ بھی نہیں جانتا تھا۔

وقت گزرتا گیا اور وہ جوان ہو گیا۔ وہ کچھ جانتا نہ تھا اور کام بھی نہیں کرتا تھا، اِس لیے کچھ کماتا بھی نہ تھا۔ اُس کا باپ جو باکمال گویّا تھا، اور اب بوڑھا ہو چکا تھا، اپنے نکمّے بیٹے کو نصیحتیں کرتا کرتا فوت ہو گیا۔ اُس کی موت کے ساتھ گھر کی حالت دِگرگوں ہو گئی۔ فاقوں کی نوبت آئی تو کمال دین کو ہوش آیا۔ وہ بہت پچھتایا کہ اُس نے باپ دادا کا فن کیوں نہ سیکھا اور کیوں بیکار عُمر گنوا دی۔ لیکن داناؤں کے بقول:

اب پچھتاوے کیا ہوت، جب چڑیاں چُگ گئیں کھیت

کمال دین سوچنے لگا کہ اب کس طرح پیسہ کمایا جائے۔ سوچتے سوچتے اُسے ایک ترکیب سُوجھی۔ اُس نے ایک باجا

خریدا اور مشہور کر دیا کہ اُس نے باجا بجانے میں کمال حاصل کر لیا ہے۔ اِتّفاق سے راجا کے کان میں یہ بھنک پڑ گئی کہ خاندانِ گوالیار میں ایک شخص نے باجا بجانے میں کمال حاصل کر لیا ہے۔ اُس نے کمال دین کو اپنے پاس بُلایا اور درباری گویّوں اور سازندوں میں شامل کر لیا۔

وقت گزرتا گیا۔ کمال دین سازندوں کے ساتھ باجالے کر جھوٹ مُوٹ بجانے لگتا۔ جھوٹ آخر جھوٹ ہے، اُس کا پول کھلنا تھا، اور ایک دن کھُل گیا۔ ہُوا یہ کہ مہارانی نے مہاراجا سے فرمائش کی کہ وہ کمال دین سے باجا سُننا چاہتی ہے۔ مہاراجا نے کمال دین کو مہارانی کی خدمت میں بھجوا دیا۔ مہارانی نے اپنی سکھیوں کے ساتھ ایک محفل سجائی اور کمال دین کو باجا سُنانے کا حکم دیا۔ کمال دین کو باجا آتا تو سُناتا۔ اُس نے ہاتھ باندھ کر عرض کیا "مہارانی صاحِبہ! میرا باجا عام باجا نہیں ہے، بلکہ خاص باجا ہے اور اِسے شامِل باجا کہتے ہیں۔

مہارانی نے کہا "یہ تو اور بھی اچھّی بات ہوئی۔ ہم بڑے شوق سے شامِل باجا سُنیں گے۔"

کمال دین بولا "لیکن مہارانی صاحِبہ! اِس باجے کی خصُوصیّت یہ ہے کہ یہ اکیلا نہیں بجتا۔ صرف دوسرے سازوں میں شامِل ہو کر بجتا ہے۔ اِسی لیے اِس کو شامِل باجا کہتے ہیں۔ آپ دوسرے سازندوں کو بھی بلائیں اور پھر میرا کمال دیکھیں۔"

مہارانی کمال دین کی یہ بات سُن کر بڑی حیران ہوئی۔ لیکن اُس کی مکّاری کو تاڑ گئی۔ اُس نے جھُوٹے اور مکّار کمال دین کو رُخصت کر دیا اور محفل بھی برخاست کر دی۔ لیکن یہ ماجرا مہاراجا کو بتا دیا۔

مہاراجا جہاں دِیدہ تھا۔ اُس نے دوسری رات جب گوَیّے اور سازندے جمع تھے، کمال دین کو شامِل باجا بجانے کا حکم دیا۔ کمال دین نے پھر وہی بہانہ بنایا کہ یہ باجا اکیلا نہیں بجتا۔ مہاراجا نے شامِل باجا لیا اور ایک سازندے کو جو یہ ہُنر جانتا تھا، دے کر کہا کہ اِسے بجاؤ۔ اُس سازندے نے اُسے اِس خوبی سے بجایا کہ سب دنگ رہ گئے۔ مہاراجا پر جب کمال دین کی بے ہُنری کا بھید کھُل گیا تو اُسے بڑا تاؤ آیا۔ اُس نے سپاہیوں کو حکم دیا کہ کمال دین کے جھوٹ اور مکّاری کی سزا یہ ہے کہ اِسے گرفتار کر کے جیل میں بند کر دو۔

کمال دین قید ہُوا تو اپنے جھوٹ اور مکّاری پر بہُت پشیمان ہوا۔ قیدیوں نے اُس کا نام شامِل باجا، قیدی باجا رکھ دیا۔ ایک مُدّت کے بعد اُسے رِہائی ملی اور وہ اپنے گھر آیا تو "شامل باجا قیدی باجا" کے لقب سے بہُت بدنام ہو چکا تھا، اور لوگوں کو اپنا مُنہ دِکھانے کے قابل نہیں رہا تھا۔

سمندری غار کا راز

محمد یونس حسرت

ٹرین کے رُکتے ہی امجد نے اپنا سوٹ کیس سنبھالا، تیز تیز قدموں سے پلیٹ فارم عبور کر کے ٹکٹ گیٹ پر کھڑے ٹکٹ کلکٹر کے حوالے کیا اور پھر مسافر خانے کی سیڑھیوں کے پاس آ کر اِدھر اُدھر نظر دوڑانے لگا۔ پروگرام کے مُطابق اُس کے دوستوں، سلیم اور جاوید، کو جو اُس کے کزن بھی تھے، اُسے لینے کے لیے یہاں آنا تھا۔ مگر اُن کا دُور دُور تک پتا نہ تھا۔ اُس نے سوچا کہ اُنہیں کسی وجہ سے دیر ہو گئی ہو گی۔ یہ سوچتے ہوئے اُس نے اپنا سوٹ کیس سیڑھیوں کے قریب دیوار کے پاس رکھ دیا اور خود اُس سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

امجد نے سلیم اور جاوید کو سال ڈیڑھ سال پہلے دیکھا تھا۔ پھر اُن کے والد کا سرکاری ملازمت کے سلسلے میں اِس دُور دراز جگہ تبادلہ ہو گیا تھا۔ یہ جگہ اگرچہ بہت دُور تھی مگر ایک خوب صورت پہاڑی علاقے میں واقع تھی۔ سلیم اور جاوید امجد کو اپنے خطوں میں یہاں آنے کی دعوت دیتے رہتے تھے اور اب امجد ایسی ہی ایک دعوت کے جواب میں اِس جگہ آیا تھا۔

امجد کی عمر چودہ سال تھی اور سلیم اُس کا ہم عمر تھا۔ جاوید اُن سے ایک سال بڑا تھا۔ طے یہی ہوا تھا کہ سلیم اور جاوید اُسے لینے کے لیے اِسٹیشن آئیں گے مگر وہ تو آ گیا تھا اور سلیم اور جاوید ابھی تک نہیں آئے تھے۔ امجد کو اُن دونوں کی طبیعت کا پتا تھا۔ اُسے یقین تھا کہ وہ اُس کے آنے کی بات کو بالکل بھول گئے ہوں گے اور پھر جب اُنہیں گاڑی کا وقت یاد آیا ہو گا تو جلدی جلدی بھاگ اُٹھے ہوں گے۔

امجد کو جاوید اور سلیم کا اِنتظار کرتے پانچ چھ مِنٹ ہو گئے تھے، اور ابھی تک اُن کی شکل دکھائی نہیں دی تھی۔ ٹرین سے اُترنے والے سب مُسافِر جا چکے تھے اور اب اُس کے سِوا اِسٹیشن پر کوئی مسافر نظر نہیں آ رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد اِسٹیشن کی عمارت کے اندر سے ایک بھاری بھرکم آدمی باہر آیا اور ایک کونے میں کھڑی ہوئی پک اَپ کی طرف بڑھا۔ شاید اُس نے کوئی سامان بُک کروا کے اِس گاڑی سے کہیں بھجوایا تھا۔ امجد بیٹھے بیٹھے اُکتا گیا تھا۔ چُناں چہ اُس

کی نظریں خود بہ خود اُس بھاری بھر کم آدمی کی طرف اُٹھ گئیں۔ وہ آدمی پک اَپ کی طرف بڑھا اور جیسے ہی اُس نے پک اَپ کا دروازہ کھولا، اندر سے ایک کُتّا چھلانگ لگا کر باہر آیا جسے وہ آدمی اندر بند کر گیا تھا۔

آدمی بدحواس سا ہو کر پیچھے کی طرف لُڑھک گیا اور کُتّا بھونکتا ہُوا اُس کے گِرد چکّر کاٹنے لگا۔ آدمی کپڑے جھاڑتا ہوا اُٹھا اور چیخ چیخ کر کتّے کو ڈانٹنے لگا۔

"موتی! موتی! خاموش ہو جاؤ ورنہ میں تمہیں ایسا سَبق سکھاؤں گا کہ ساری عُمر یاد رکھو گے۔"

مگر کتّا خاموش ہونے کی بجائے زور زور سے بھونکتے ہوئے اُس کے گرد چکّر کاٹتا رہا۔ اُس آدمی نے آگے بڑھ کر اُس کو پکڑنے کی کوشش کی مگر وہ چھلانگ لگا کر پرے ہٹ گیا۔ اِس پر آدمی کا پارہ اور چڑھ گیا۔ وہ زور سے چِلّایا "میں کہتا ہوں، چل کے آرام سے اندر بیٹھو!"

مگر کتّے نے اُس کے اِس حکم کو بالکل نظر انداز کر دیا اور اُسی طرح بھونکتا ہوا اُس کے گِرد چکّر کاٹتا رہا۔ اِس پر وہ آدمی بالکل ہی آپے سے باہر ہو گیا۔ اُس نے پک اَپ کے پچھلے حصّے میں پڑی ہوئی ایک موٹی سی چھڑی اُٹھائی اور کتّے کو دھڑا دھڑ پیٹنا شروع کر دیا۔

امجد سے ایک بے زبان جانور پر یہ ظُلم دیکھا نہ گیا۔ وہ لپک کر اُس آدمی کے قریب پہنچا اور اُس کا ہاتھ پکڑ کر بولا "ارے صاحِب! کیوں اِس بے زبان کو یوں بے دردی سے مار رہے ہو؟"

اُس آدمی نے ایک نظر امجد کی طرف دیکھا اور پھر اُس کا ہاتھ پرے جھٹکتے ہوئے بولا "اپنے کام سے کام رکھو، لڑکے! یہ کتّا میرا ہے اور میں جانتا ہوں کہ اِس کے ساتھ مجھے کیا سلوک کرنا چاہیئے۔"

یہ کہتے ہوئے اُس نے چھڑی والا ہاتھ پھر ہوا میں بلند کیا۔ یہ دیکھ کر امجد نے تیزی سے چھلانگ لگائی اور کتّے کو بازوؤں میں لے کر ایک طرف ہو گیا۔ چھڑی پوری قوّت کے ساتھ زمین سے ٹکرائی اور ٹوٹ کر دو ٹکڑے ہو گئی۔

آدمی نے حیرانی سے پہلے امجد اور کتّے کو دیکھا اور پھر اپنے ہاتھ میں ٹوٹی ہوئی چھڑی کو۔ پھر چھڑی کو پرے پھینکتے ہوئے بولا "اچھّی بات ہے! لیکن یہ اب میرے قریب بھی آیا تو میں اِسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

یہ کہہ کر وہ پک اَپ میں بیٹھا اور وہاں سے رفوچکّر ہو گیا۔

امجد نے کتّے کی پیٹھ کو پیار سے تھپ تھپایا اور بولا "لو، اب تمہاری اُس سے جان چھوٹ گئی۔ تم جہاں جانا چاہو، چلے جاؤ۔"

اُس نے کتّے کو زمین پر چھوڑ دیا اور واپس اپنے سوٹ کیس کی طرف بڑھا۔ مگر یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ کتّا کہیں جانے کی بجائے دُم ہلاتا ہوا اُس کے پیچھے پیچھے آ رہا ہے۔ وہ سوٹ کیس کے پاس آکر بیٹھا تو کتّا بھی اُس کے قدموں میں آ بیٹھا اور دُم ہلاتا ہوا اُس کے بُوٹ چاٹنے لگا۔ شاید وہ اِس طرح اپنی شُکر گزاری کا اظہار کر رہا تھا۔ اور پھر ایک ساتھ دو آوازوں نے اُس کا دھیان کتّے کی طرف سے ہٹا دیا۔

"آہا! یہ رہے امجد بھیا!۔"

امجد نے نظریں اُوپر اُٹھائیں۔ جاوید اور سلیم کے ہنستے مسکراتے چہرے اُس کے سامنے تھے۔

"ارے جاوید! ارے سلیم! اتنی دیر کر دی تم نے؟ میں تو سوکھ کر آدھا رہ گیا ہوں تمہارا انتظار کرتے کرتے" اور وہ اُٹھ کر اُن سے لپٹ گیا۔

"بھئی امجد، ہم مُعافی چاہتے ہیں" جاوید نے کہا "اصل میں بات یہ ہوئی کہ ابّو کو کچھ شاپنگ کرنا تھی۔ اِس وجہ سے ہمیں دیر ہو گئی۔ اِس وقت بھی وہ ایک دکان میں ہیں اور اُن کی کار دکان کے باہر کھڑی ہے۔ ہمیں وہاں جانے کے لیے ذرا پیدل چلنا پڑے گا۔"

"کوئی بات نہیں" امجد نے اپنا سوٹ کیس اُٹھاتے ہوئے کہا "یہ کون سی مشکل بات ہے میرے لیے۔"

سلیم نے امجد سے اُس کا سوٹ کیس لے کر خود اُٹھا لیا اور وہ تینوں مسافر خانے سے باہر کی طرف بڑھے۔ کتا بھی اُن کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ امجد نے "ہشت! ہشت!" کر کے اُس کو بھگانا چاہا مگر وہ برابر اُس کے پیچھے لگا رہا۔ امجد نے جلدی جلدی جاوید اور سلیم کو اُس واقعے سے آگاہ کیا جو اُن کے آنے سے پہلے اُس کے ساتھ پیش آیا تھا۔

"اب میں کیا کروں؟" اُس نے جیسے بے بسی سے کہا "میں اِسے اپنے ساتھ تو نہیں لے جا سکتا۔"

"میں اِس کتّے کو پہچانتا ہوں" جاوید نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "یہ ہمارے پڑوسی جابر خاں کا کتا موتی ہے۔ بڑا ظالم اور خوف ناک شخص ہے وہ۔ لیکن اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتا تم سے ہِل گیا ہے۔ میرا خیال ہے، تم اِسے اپنے ساتھ ہی لے چلو۔ ابّو بُرا نہیں مانیں گے۔"

"میں اِسے ساتھ تو لے چلوں مگر اِسے جابر خاں جیسے ظالم کے حوالے نہیں کر سکتا۔ اُس بدبخت نے اِس بے چارے کو جس بُری طرح پیٹا ہے، اِس کے بعد ایسا کرنا تو اِس کے ساتھ بڑی زیادتی ہوگی۔ تو پھر اب کیا کیا جائے؟"

"کرنا کیا ہے؟" سلیم نے ہنستے ہوئے کہا "یہ ہمارے ساتھ مانوس تو ہو ہی گیا ہے، اِس لیے یہ سمجھو کہ یہ جابر خاں کا نہیں، تمہارا اپنا پالتو کتا ہے۔ ہم یہ سمجھ لیتے ہیں کہ تم اپنے پالتو کتے سمیت یہاں آئے ہو۔ سو ہم تمہارے ساتھ اِسے بھی اپنے گھر لے چلتے ہیں۔ ویسے ہمارا گھر اِس کے لیے اجنبی بھی نہیں، یہ ہمارے باغ میں ہمارے کتے ڈبّو کے ساتھ کھیلتا رہتا ہے۔"

امجد نے یہ سُن کر اطمینان کا سانس لیا اور یوں اُس کے ہمراہ موتی بھی سلیم اور جاوید کے گھر پہنچ گیا۔ اُس وقت اُن میں سے کسی کو بھی اندازہ نہیں تھا کہ امجد نے موتی کے ساتھ جو مہربانی کا سلوک کیا ہے، اُس کو اُن کی اور خاص طور پر امجد کی زندگی میں کیا اور کیسی اہمیت حاصل ہونے والی ہے!

شام کے کھانے سے فراغت کے بعد جاوید اور سلیم امجد کو اپنا مکان دکھا رہے تھے جو ایک پُرانی حویلی کی طرز پر بنا ہوا تھا۔ مکان دو منزلہ تھا۔ ایک زینہ اُس کے اگلے حصّے میں تھا اور ایک پچھلے حصّے میں۔ دوسری منزل پر کئی بیڈ روم تھے اور اُن میں سے ایک اُنھوں نے امجد کے لیے مخصوص کر دیا تھا۔ اُس وقت سلیم اور جاوید امجد کو اُس کا وہی کمرا دکھا رہے تھے۔

یہ حویلی نُما مکان ایک چھوٹی سی پہاڑی پر تھا، اور یہ ایک ایسی جگہ تھی جہاں قُدرت کی مہربانی سے پہاڑ، سمُندر، جنگل اور کھیت ایک جگہ جمع ہو گئے تھے۔ مکان کے عین پیچھے ایک خاصا وسیع باغ تھا جو ایک قریبی پہاڑی کی چوٹی تک چلا گیا تھا۔ نیچے سمندر کی لہریں اُس پہاڑی سے آ آ کر ٹکراتی تھیں اور ان لہروں سے مُسلسل ایسی آواز پیدا ہوتی تھی جیسے بہُت سے ستار ایک ساتھ بج رہے ہوں۔ باغ کے آخر میں پہاڑی چوٹی سے ذرا اِدھر، ایک مضبوط جنگلا لگا دیا گیا تھا تاکہ کوئی شخص بے خبری میں آگے نہ چلا جائے۔ اِس باغ میں سے دوسری طرف ایک پگ ڈنڈی نکلتی تھی جو قریبی کھیتوں اور اُونچی نیچی پہاڑیوں کے درمیان سے ہوتی ہوئی دور تک چلی گئی تھی۔

"کل ہم سیر کے لیے چلیں گے" سلیم نے کہا "موسم صاف ہو تو میلوں دُور جا سکتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے" امجد نے کہا "یہاں سیر کا یقیناً بڑا مزا آئے گا۔"

"امجد بھائی، تمہیں بھوتوں سے تو ڈر نہیں لگتا؟"
جاوید کا یہ سوال سُن کر امجد نے کسی قدر حیرانی سے اُس کی طرف دیکھا۔ اُس کے چہرے پر شرارت اور سنجیدگی کے ملے جُلے آثار تھے۔

"میں تو بھوتوں کو مانتا ہی نہیں" امجد نے سینہ تان کر کہا "ویسے، کیا تم مجھے یہ بتانا چاہتے ہو کہ یہ جگہ آسیب زدہ ہے؟"

"سُنا تو یہی ہے" سلیم نے جاوید کی ہاں میں ہاں مِلاتے ہوئے کہا "یہ ایک خاصی پُرانی حویلی ہے۔ پُرانی حویلیوں اور عمارتوں میں آنے جانے کے کئی خُفیہ راستے ہوا کرتے تھے۔ اِس حویلی میں بھی ہوں گے۔ یہ اور بات ہے کہ ہمیں اِن میں سے کسی راستے کا بھی عِلم نہیں۔ ہو سکتا ہے بھوت اِنہی خفیہ راستوں سے آتے جاتے ہوں۔"

امجد نے کہا "اگر یہاں واقعی کوئی بھوت آتا ہے تو اُسے آنے جانے کے لیے کسی خُفیہ راستے کی ضرورت نہیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ تم میں سے کسی نے اُس بھوت کو دیکھا ہے؟"

"نہیں، ہم میں سے تو کسی نے نہیں دیکھا" جاوید بولا "تمہیں دکھائی دے جائے تو اور بات ہے۔"

"اگر وہ مجھے دکھائی دیا تو میں اُس کی وہ گت بناؤں گا کہ دوبارہ یہاں آنے کا نام بھی نہیں لے گا" امجد نے سینے پر ہاتھ مار کر کہا۔

امجد نے سینے پر ہاتھ مار کر بھوت کی گت بنانے کی بات تو کر دی تھی مگر رات کو جب وہ اپنے کمرے میں سونے کے لیے لیٹا تو کسی قدر گھبراہٹ محسوس کر رہا تھا۔ جاوید اور سلیم کی باتیں اُس کے دماغ میں گونج رہی تھیں۔ ایک تو کمرا خاصا بڑا تھا، اُوپر سے اُس کی دیواریں بھی پُرانے قلعوں کی طرح موٹی موٹی تھیں۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ کمرے کا بھاری دروازہ کھُلتے اور بند ہوتے وقت بہُت زور سے چَرچَراتا تھا۔

باہر کہیں اندھیرے میں کسی اُلّو کی ڈراؤنی سی ہُو ہُو سُنائی دی تو امجد کے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ وہ گھبرا کر کھڑکی کی طرف بڑھا اور تیزی سے اُس کے پردے ہٹا دیے۔ دُور سمندر میں گزرتے ہوئے جہازوں کی روشنیاں تاروں کی طرح جھل مِل جھلمِل کرتی دکھائی دے رہی تھیں۔ اِس کے ساتھ ہی اُس نے روشنیوں کا ایک اور جھُرمُٹ دیکھا، جو اُن روشنیوں سے زیادہ قریب اور زیادہ روشن تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے روشنیوں کا یہ جھُرمُٹ سمندر کی اُس کھاڑی میں ہے جس کا پانی اِس مکان کے قریب ایک پہاڑی سے ٹکراتا تھا۔

"لگتا ہے، یہ مچھلی پکڑنے والوں کی کشتی ہے" امجد نے اپنے جی میں کہا۔ پھر یکایک وہ روشنیاں یوں بُجھ گئیں جیسے کسی نے سوئچ آف کر دیا ہو۔ یہ بات کچھ عجیب سی تھی۔ امجد نے سوچا، کل صبح اِن روشنیوں کے بارے میں سلیم اور جاوید سے بات کروں گا۔

یہ سوچ کر وہ بستر کی طرف بڑھا ہی تھا کہ باہر زینے پر چَرچَراہٹ سی ہوئی۔ اِسے سُن کر اُسے اُن باتوں کا خیال آ گیا جو اُس کے اور سلیم اور جاوید کے درمیان ہوئی تھیں۔ اُس نے اپنے آپ سے کہا "ایسا لگتا ہے کہ اِس حویلی کا بھوت آج ضرور دکھائی دے گا مجھے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ پانی کو پسند کرتا ہے یا نہیں۔"

وہ بستر میں گھُس تو گیا مگر دن بھر کے سفر کی تھکاوٹ کے باوجود نیند اُس سے کوسوں دُور تھی۔ اُس کی نظریں دروازے پر جمی ہوئی تھیں اور کان کسی آنے والے کی آہٹ کو سُننے کی کوشش کر رہے تھے۔

کچھ دیر ہر طرف خاموشی رہی۔ کسی قسم کی حرکت نہیں ہوئی۔ پھر باہر زینے کی چرچراہٹ سُنائی دی اور امجد دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اِنتظار کرنے لگا کہ دیکھیں اب کیا ہوتا ہے۔

اُس نے اپنے سوٹ کیس میں سے پلاسٹک کا گلاس نکال کر اُس میں پانی بھرا، پھر کمرے کے دروازے کو ایک ڈیڑھ اِنچ کھولا اور پانی سے بھرا ہوا گلاس دروازے کے ایک پٹ پر ٹِکا دیا۔ یہ کام کر کے اس نے بتّی بُجھائی اور جلدی سے بستر میں جا گھُسا۔

پھر واقعی کچھ ہو گیا۔ چند مِنٹ بعد دروازے کے تختے چرچرانے کی آواز آئی۔ کھڑکی سے آتی ہوئی مدّھم مدّھم روشنی میں امجد نے دیکھا کہ دروازے کے پٹ آہستہ آہستہ کھُل رہے ہیں۔ پھر اچانک اُن پٹوں کے درمیان اُسے ایک

اُونچی لمبی اور سفید سفید سی شے دکھائی دی۔ شاید یہ بھوت تھا جو ہلکی ہلکی آواز میں کراہ بھی رہا تھا۔ امجد سانس روکے اور دروازے پر نظریں جمائے چُپ چاپ لیٹا رہا۔ دروازے کے پَٹ کچھ اور کھُلے اور بھوت کمرے کے اندر داخل ہونے کے لیے قدم بڑھانے لگا۔

"پٹاخ!"

دروازے کے پٹ کے اُوپر پانی سے بھرا ہوا جو گلاس رکھا تھا، وہ بھوت کے اُوپر گرا اور اُس کے سفید لباس کو بھگو کر فرش پر جا گرا۔ بھوت ایک دم رُک گیا۔ پھر پلٹا اور ایک زور کی چیخ مار کر بھاگ کھڑا ہوا۔ امجد کی ہنسی چھوٹ گئی کیوں کہ اُس نے بھوت کو پہچان لیا تھا۔

اگلی صبح وہ بیدار ہو کر باہر آیا تو اُس نے دیکھا کہ صحن میں اَلگنی پر کچھ کپڑے پڑے ہوئے ہیں۔ اُن میں ایک پاجامہ تھا اور ایک بستر کی سفید چادر۔ امجد کو ہنسی آ گئی۔ یقیناً یہ بھوت کے کپڑے تھے جو رات گلاس کے پانی نے گیلے کر دیے تھے۔

ناشتے کی میز پر امجد نے سلیم سے کہا "سلیم بھائی، رات میری ملاقات تمہارے بھوت سے ہوئی تھی۔ وہ سفید چادر اوڑھے ہوئے تھا۔ مگر وہ تو بڑا ہی ڈرپوک بھوت ثابت ہوا جیسے ہی کمرے کے اندر آنے لگا، میں خبردار کا نعرہ لگا کر اُس کی طرف لپکا۔ ڈر کے مارے اُس کا پیشاب خطا ہو گیا۔ اُدھر صحن میں اَلگنی پر جو چادر اور پاجامہ سُوکھنے کے لیے ڈالا گیا ہے وہ شاید اُسی بھوت کا ہے۔"

یہ کہہ کر امجد نے زور کا قہقہہ لگایا اور سلیم بے چارہ جھینپ کر رہ گیا، کیوں کہ بھوت کا سوانگ رچانے کی کوشش اُسی نے کی تھی۔

سلیم کی جھینپ کو مٹانے کے لیے جاوید نے باتوں کا موضوع بدل دیا۔ اُس نے کہا "امجد بھائی، ناشتے کے بعد سمُندر میں تیرنے چلیں گے۔"

امجد نے کہا "یہ تو بڑی اچھّی بات ہے۔ تم جانتے ہی ہو مجھے کتنا شوق ہے تیراکی کا۔ مگر اِس کے لیے ہمیں شاید خاصی دور جانا پڑے۔"

"یہاں ایسا کوئی ساحل نہیں ہے جہاں ہم تیر سکیں" جاوید نے کہا "لیکن یہاں سمُندر کا پانی سارا سال آتا رہتا ہے۔ کئی سال پہلے ایک پہاڑی سے کچھ تودے ٹوٹ کر گرے

تھے۔ ہم نے اُن کے پتھروں کو جوڑ جاڑ کر ایک تالاب سا بنالیا ہے۔ ہم اُسی میں تیرنے کا شوق پورا کر لیتے ہیں۔ اُس کا پانی زیادہ گہرا بھی نہیں ہے۔"

"خوب! بہت خوب!" امجد نے کہا "یہ تو اور بھی اچھی بات ہے"۔

امجد، سلیم اور جاوید تیراکی کا لباس پہن کے مکان کے پچھلے حصّے میں واقع باغ سے نکلے اور پگ ڈنڈی پر چلتے ہوئے آگے بڑھے ہی تھے کہ نہ جانے کس طرف سے ڈبّو اور موتی آن ٹپکے۔

"اِس موتی کو تو اپنے گھر جانے کی کوئی جلدی معلوم نہیں ہوتی" جاوید نے کہا "ایسا لگتا ہے کہ اب یہ ہمیشہ کے لیے تمہارا ہو گیا ہے۔"

سلیم آگے بڑھا اور اُس کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے وہ اُس پہاڑی کے دامن میں پہنچ گئے جہاں پہاڑی سے گرے ہوئے پتھروں کو جوڑ کر تالاب کی شکل دے دی گئی تھی۔ امجد نے پانی کو چھُو کر دیکھا۔ وہ تازہ بھی تھا اور گرم بھی۔ اُس کی لہریں پتھروں سے یوں آہستہ آہستہ ٹکرا رہی تھیں جیسے اُن کا مُنہ دھلا رہی ہوں۔

جاوید نے تالاب کے پتھروں کی طرف اِشارہ کرتے ہوئے کہا "اِس وقت تو پانی پتھروں سے نیچا نظر آ رہا ہے مگر جب سمُندر میں جُوار بھاٹا آتا ہے یعنی چاند کی کشش کی وجہ سے سمُندر کا پانی خشکی کی طرف بڑھتا ہے تو سارے پتّھر پانی میں چھُپ جاتے ہیں اور کسی کو پتا نہیں چل سکتا کہ تالاب کہاں ہے۔ جب پانی اُترتا ہے تو پھر تالاب دکھائی دیتا ہے۔"

"واہ!" امجد نے داد دیتے ہوئے کہا "تم نے تو جُغرافیے کی ساری معلومات رٹ رکھی ہیں۔"

"ہاں، بھائی" جاوید نے خوش ہو کر کہا "آؤ، اب چلیں"۔

پہلے جاوید نے اور پھر سلیم نے ایک پتّھر پر چڑھ کر تالاب میں چھلانگ لگائی۔ چھلانگ لگانا تو امجد کو بھی آتا تھا مگر وہ اِس پتھروں والے تالاب میں چھلانگ لگا کر کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا۔ وہ چھلانگ لگانے کی بجائے خاموشی سے پانی میں اُتر گیا۔

جیسے ہی اُس نے اپنے پاؤں پانی میں ڈالے، اُس کے مُنہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ نیچے سے کسی نے اُس کے دونوں پاؤں گھسیٹ کر اُسے پانی کے اندر کھینچ لیا تھا۔ اُس نے اپنے پاؤں چھُڑانے کے لیئے تھوڑی سی کش مکش کی تو اُس کے پاؤں چھوڑ دیے گئے۔ جیسے ہی وہ سانس لینے کے لیے پانی کی سطح پر آیا، اُسے سلیم اور جاوید کے ہنستے ہوئے چہرے دکھائی دیے۔ سلیم نے کہا "تم نے رات ہمارے بھوت کے ساتھ جو سلوک کیا تھا، یہ اُس کا جواب ہے۔"

امجد ہنس دیا۔ حساب برابر ہو گیا تھا، اِس لیئے بُرا ماننے کی کوئی وجہ نہ تھی۔

آدھ پَون گھنٹا تالاب میں تیرنے کے بعد وہ واپس ہوئے تو خوب ہشّاش بشّاش تھے۔ اُن کی بھوک بھی چمک گئی تھی۔ واپس آ کر خوب ڈٹ کر کھانا کھایا اور پھر طے شُدہ پروگرام کے مُطابق لمبی سیر کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ دونوں کُتّے اُن کے ساتھ تھے۔ پگڈنڈی پر کوئی دو سو گز چلنے کے بعد وہ مکئی کے اُن کھیتوں کے قریب پہنچ گئے جنہیں امجد نے اپنے کمرے کی کھڑکی سے دیکھا تھا۔ اُن کھیتوں کے قریب پہنچتے ہی سلیم نے کہا "ذرا کھیت کے کنارے کنارے رہنا، امجد بھائی۔ یہ کھیت اور اِس سے آگے جو چراگاہ ہے، وہ جابر خاں کی ہے۔ وہی جابر خاں جس سے اِسٹیشن پر تمہاری جھڑپ ہوئی تھی۔ وہ بڑا بدمزاج ہے اور اگرچہ یہ پگڈنڈی عام گزرگاہ ہے لیکن وہ یہ پسند نہیں کرتا کہ کوئی شخص اُس کے کھیتوں میں سے تو کیا، اُن کے قریب سے بھی گزرے۔ اگر ہم پگڈنڈی ہی پر چلتے رہے تو اُسے ہم سے اُلجھنے کا بہانہ نہیں ملے گا۔"

وہ آگے پیچھے قطار بنا کر پگڈنڈی پر چلنے لگے۔ دونوں کُتّے اُن کے پیچھے پیچھے آ رہے تھے۔ اپنی طرف سے تو اُنہوں نے بڑی اِحتیاط کی تھی کہ جابر خاں کو اُن سے اُلجھنے کا بہانہ ہاتھ نہ آئے مگر قدرت کے کاموں میں کون دخل دے سکتا ہے۔ وہ بڑے سکون اور اِطمینان سے پگڈنڈی پر چلے جا رہے تھے کہ کھیت میں سے ایک خرگوش نکل کر بھاگا۔ دونوں کُتّے، ڈبّو اور موتی، اُس کے پیچھے لپکے۔ وہ جھاڑی سے نکل کر کھیت میں گھُس گیا تو کُتّے بھی اُس کے تعاقب میں اُس کھیت میں جا گھُسے۔ امجد، سلیم اور جاوید نے اُنہیں آوازیں دیں۔ مگر وہ اُس وقت

واپس آئے جب خرگوش اُن کی پہنچ سے دُور ہو گیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ مکئی کے کھیتوں سے نکل کر چراگاہ میں پہنچ گئے۔ چراگاہ کے پرلے سِرے پر ایک باڑا بنا ہوا تھا سلیم نے اُس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "امجد بھائی، وہ ہے جابر خاں کا فارم۔"

ابھی بات سلیم کے مُنہ سے نکلی ہی تھی کہ بھاری بھرکم جابر خاں باڑے سے باہر آیا۔ اُس کی نگاہ امجد، سلیم اور جاوید پر پڑی تو چلّاتے ہوئے اُن کی طرف بڑھا۔

"چُپ چاپ کھڑے رہو، اِس کی بات پر بالکل دھیان نہ دو" سلیم نے امجد سے کہا "ہم پگڈنڈی پر کھڑے ہیں اور یہ پگڈنڈی عام راستہ ہے۔"

موتی نے جو جابر خاں کی آواز سُنی تو اُس نے کان دبائے اور دبک کر ایک طرف کو ہو گیا۔ ڈبّو کو جابر خاں سے کوئی خطرہ نہ تھا، اس لیے وہ امجد، سلیم اور جاوید کے پاس ہی کھڑا رہا۔

جابر خاں نے دوسرے جانوروں کے عِلاوہ دو بکرے بھی پال رکھے تھے جو خوب موٹے تازے تھے اور نوک دار سینگوں کی وجہ سے خاصے خوف ناک دکھائی دیتے تھے۔ دونوں بکرے مرکھنے تھے اور جسے بھی سامنے دیکھتے اُسے ٹکّر مارنے کو دوڑتے۔

جابر خاں نے آگے بڑھ کر ایک ذرا بڑے بکرے کی گردن سے رسّی کھولی اور اُس کی پیٹھ پر ایک زور کی دھپ جماتے ہوئے اُسے امجد، سلیم اور جاوید کی طرف دھکیل دیا۔

"بچو، امجد!" سلیم نے چیخ کر کہا اور وہ تینوں اِدھر اُدھر بھاگنے لگے۔ امجد بکرے کے قریب تھا اِس لیے بکرے نے اُس کا پیچھا کرنا شروع کر دیا۔ ڈبّو نے شاید اُسے بھی خرگوش کی طرح کا ایک کھیل سمجھا اور اُچھل اُچھل کر بھونکنے لگا۔ موتی پہلے تو دبکا بیٹھا رہا لیکن جب اُس نے دیکھا کہ اُس کے مُحسن امجد کو خطرہ ہے، تو وہ چھلانگ لگا کر بکرے کی طرف لپکا اور اُسے بھونک بھونک کر امجد سے پرے ہٹانے کی کوشش کرنے لگا۔ موتی کی اِس حرکت سے بکرا غُصّے میں آگیا۔ امجد اپنی جان بچانے کے لیے اِدھر اُدھر بھاگ رہا تھا اور اِس جگہ سے ناواقف ہونے کے باعِث اُسے کچھ اندازہ نہ تھا کہ اُسے کہاں جانا چاہیے اور کہاں نہیں۔ بکرے سے بچنے کی کوشش میں وہ قریبی پہاڑی کی طرف چلا گیا تھا۔ بکرے نے آگے بڑھ کر اُسے ایک زور دار ٹکّر ماری اور وہ چیخ مار کر پہاڑی کی چوٹی سے لُڑھکتا ہوا نیچے جا گرا، جہاں سمُندر کی لہروں کے ٹکرانے سے مُسلسل شور پیدا ہو رہا تھا۔ (باقی اگلے مہینے)

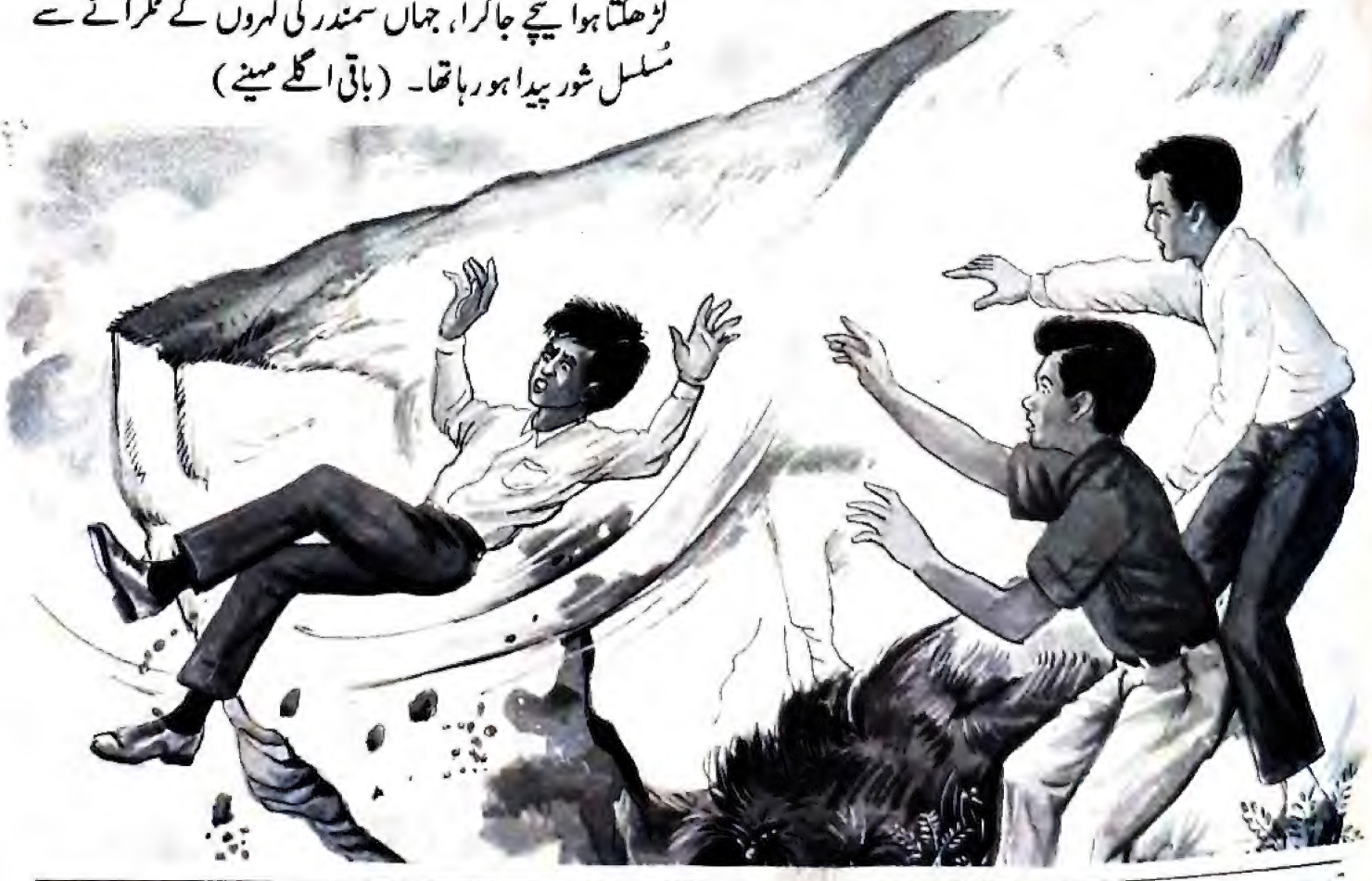

آیئے مسکرائیں

ایک موٹا آدمی، جس کا پیٹ مٹکے کی طرح پھولا ہُوا تھا، موٹر سائیکل لے کر پٹرول پمپ پر گیا اور بولا "دو لیٹر پٹرول ڈال دو۔"

پٹرول والے نے پہلے موٹر سائیکل کو دیکھا اور پھر موٹے کا پیٹ دیکھ کر کہنے لگا "کون سی ٹینکی میں ڈالوں؟"

(احسن اسد ــــ؟)

ایک صاحب دعوتِ ولیمہ میں سالن کے ڈونگوں پر ڈونگے صاف کیے جا رہے تھے کہ ایک آدمی نے اُنہیں ٹوک کر کہا "جناب، پانی کے لیے بھی کچھ جگہ رکھیے گا۔"

وہ صاحب بولے "بس کتنی ہی بھری ہوئی کیوں نہ ہو، کنڈکٹر اپنی جگہ بنا ہی لیتا ہے۔"

(ذیشان آفتاب، واہ چھاؤنی)

رات کا وقت تھا۔ مُلّا نصیرُالدّین سو رہے تھے کہ اچانک باہر گلی میں سے شور کی آوازیں آئیں۔ مُلّا کی بیوی نے اُنہیں جگا کر کہا "ذرا دیکھیے تو باہر کون لڑ رہا ہے؟"

سردی بہت تھی۔ مُلّا رضائی اوڑھ کر باہر گئے تو دیکھا کہ دو آدمی آپس میں لڑ رہے ہیں۔ اُنہوں نے مُلّا کو رضائی اوڑھے دیکھا تو اُن کی رضائی اُتار کر بھاگ گئے۔ مُلّا غصّے سے بڑبڑاتے ہوئے گھر میں آئے تو بیوی نے پوچھا "وہ آدمی کس لیے لڑ رہے تھے؟"

مُلّا بولے "میری رضائی کے لیے۔"

(پلوشہ بشیر یونیورسٹی ٹاؤن پشاور)

جج (چور سے): ۔ تم کہتے کہ تم نے کپڑے کی دُکان میں پانچ بار چوری کی اور صرف ایک ساڑھی چُرائی۔

چور: ۔ جی ہاں، جناب۔

جج: ۔ لیکن صرف ایک ساڑھی چُرانے کے لیے پانچ بار چوری کرنے کی کیا ضرورت تھی؟

چور: ۔ حضُور، چار بار میری بیوی کو ساڑھی پسند نہیں آئی۔ (احسن اسد)

طالبِ علم اِمتحان دے رہے تھے کہ ایک لڑکے نے دوسرے لڑکے سے کچھ پوچھا۔ نگران نے دیکھ لیا۔ اُس نے غُصّے سے کہا "کیا پُوچھا ہے اُس نے تم سے؟"

لڑکے نے جواب دیا "سر، اُس نے جاپان کے دارُالحکومت کا نام پوچھا تھا۔"

نگران نے کہا "تم نے بتا دیا؟"

لڑکا بولا "نہیں، سر۔ میں نے اُس سے کہا، اب تو ٹوکا ہے، آیندہ مت ٹوکیو۔" (محمّد ندیم، جھنگ شہر)

ایک صاحب کے گھر کا پائپ پھٹ گیا۔ اُنہوں نے پلمبر کو فون کیا کہ آ کر پائپ ٹھیک کر جائے۔ وہ ایک گھنٹے بعد آیا اور بولا "جناب، میرے دیر سے آنے پر آپ کو کچھ پریشانی تو نہیں ہوئی؟"

وہ صاحب بولے "جی نہیں۔ اِس دوران میں مَیں اپنے بیوی بچّوں کو تیرنا سِکھا چُکا ہوں۔"

(محمّد متین، سُلطان آباد کراچی)

ایک آدمی نے اپنے دوست کو کچھ رقم اُدھار دی۔ جب کافی دن گزر گئے اور دوست نے رقم واپس نہ کی تو اُس نے کہا "میرے پیسے دے دو ورنہ قیامت کے دن میں تمہارے سینے پر بیٹھوں گا۔"

دوست بولا "مجھے چند اور لوگوں کا اُدھار بھی دینا ہے۔ تمہیں جگہ ملے تو تم بھی بیٹھ جانا۔"

(کلثوم خاتون، سُلطان آباد کراچی)

ماں باپ کی خِدمت

اللہ کی ہِدایت، ماں باپ کی ہے خِدمت
دونوں جہاں کی عِزّت، ماں باپ کی ہے خِدمت

دِل کی بہار یہ ہے، جاں کا قرار یہ ہے
ہر اِک قدم پہ رحمت، ماں باپ کی ہے خِدمت

بُوڑھا اُنہیں جو پانا، ہرگز نہ دِل دُکھانا
قُرآن کی نصیحت، ماں باپ کی ہے خِدمت

گر یہ نہیں ہیں راضی، ناراض ہے خدا بھی
اللہ کی مُسرّت، ماں باپ کی ہے خِدمت

اِنسانیّت کی خِدمت، بے شک ہے اِک عِبادت
لیکن بڑی عبادت، ماں باپ کی ہے خِدمت

اِن کی سبھی دُعائیں، درد و اَلَم مٹائیں
ہر دم پیامِ راحت، ماں باپ کی ہے خِدمت

پروفیسر محمّد احمد شاد

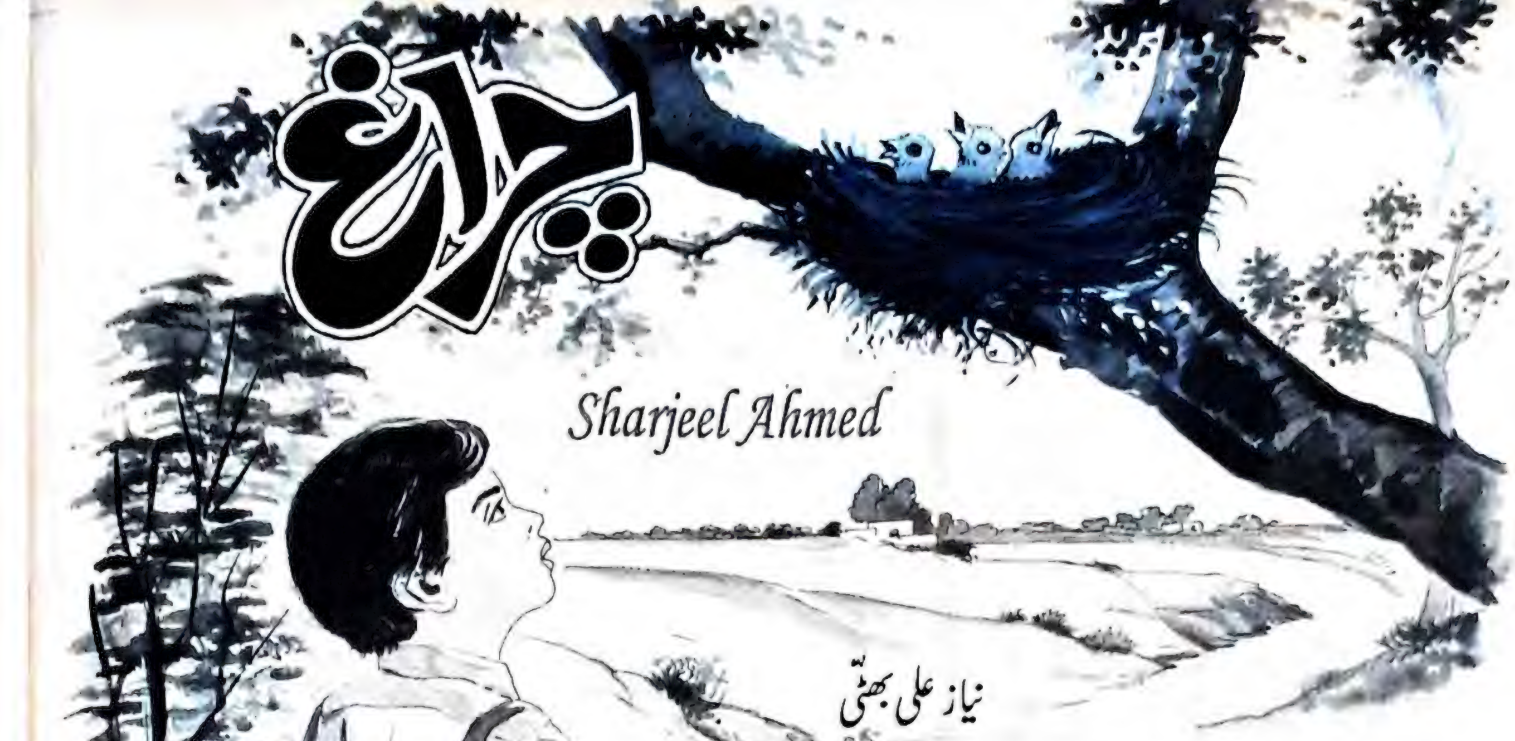

چراغ

نیاز علی بھٹی

چراغ پانچویں جماعت کا طالبِ علم تھا۔ اُس کا اِسکول اُس کے گاؤں سے دو میل دور ایک دوسرے گاؤں میں تھا اور وہ ہر روز گاؤں کے بچّوں کے ساتھ وہاں پڑھنے جاتا تھا۔

موسمِ بہار کی آمد آمد تھی۔ درختوں پر نئی کونپلیں پھوٹ رہی تھیں۔ پھول کِھل رہے تھے۔ پرندے اپنی اپنی بولیوں میں بہار کی آمد کی خوش خبری دے رہے تھے۔ چراغ یہ سماں دیکھ کر بہُت خوش ہوتا۔

ایک دن وہ اِسکول جارہا تھا کہ اُس نے کھیتوں میں ایک درخت پر ایک چڑیا کو دیکھا جو کچھ تنکے مُنہ میں دبائے بیٹھی چُوں چُوں کر رہی تھی۔ اُس کا دِل چاہا کہ وہ وہیں بیٹھ جائے، چڑیا اُس کے پاس آئے اور وہ اُس کے ساتھ کھیلے۔ مگر اُسے اِسکول کو دیر ہورہی تھی اور آج اُسے وظیفے کا اِمتحان بھی دینا تھا۔ لِہٰذا وہ زیادہ دیر وہاں رُک نہ سکا اور جلدی جلدی اِسکول پہنچ گیا۔

واپسی پر اُس نے دیکھا کہ چڑیا نے گھونسلا بنالیا ہے اور اب وہ اُس میں اِطمینان سے بیٹھی ہے۔ جب وہ گھر پہنچا تو اپنی ماں کو چڑیا کی بات بتا کر پُوچھا "امّاں، چڑیا گھونسلے میں کیا کرے گی؟"

"بیٹے، وہ اُس کا گھر ہے۔ وہاں وہ انڈے دے گی، جن میں سے بچّے نکلیں گے اور یوُں اُس کا خاندان بڑھے گا" ماں نے جواب دیا۔

"اچھا! چڑیا انڈے دے گی، اور انڈوں میں سے بچّے نکلیں گے" اُس نے حیرت سے کہا۔

"ہاں" ماں نے پیار سے اُس کا گال تھپ تھپایا۔

"لیکن امّاں، اگر آندھی آگئی، بارش آگئی، بجلی کڑکی تو......؟" چراغ نے پوچھا۔

"خُدا سب کا مُحافِظ ہے" ماں نے اُسے تسلّی دی۔

اب چراغ ہر روز اسکول جاتے اور آتے ہوئے چڑیا کے گھونسلے کو دیکھتا جس میں کبھی چڑیا ہوتی اور کبھی نہیں ہوتی۔ وہ کان پر ہاتھ رکھ کر چڑیا کے بچّوں کی آواز سُننے کی کوشش کرتا مگر اُسے مایوسی ہوتی۔ اسکول سے واپسی پر وہ ہر روز ماں کو چڑیا کے متعلق بتاتا اور آخر میں پوچھتا "امّاں، چڑیا کے بچّے کب نکلیں گے؟"

ماں اُسے تسلّی دیتی اور کہتی "جس دن نکلیں گے، وہ خود ہی چُوں چُوں کر کے تمہیں بتا دیں گے۔" اور یُوں چراغ خوش ہو جاتا۔

پھر ایک دن اسکول سے واپسی پر اُس نے گھونسلے میں چُوں چُوں کی آوازیں سُنیں تو اُس کی خوشی کی اِنتہا نہ رہی۔ وہ بھاگا بھاگا گھر آیا اور چیخ کر بولا "امّاں، امّاں....."

"کیا ہوا بیٹے؟ آج تم بہت خوش نظر آ رہے ہو؟" ماں نے کہا۔

"امّاں تُم ٹھیک کہتی تھیں۔ آج چڑیا کے گھونسلے میں اُس کے بچّے چوں چوں کر رہے تھے۔" چراغ نے جلدی جلدی ماں کو بتایا اور پھر بولا "امّاں، کل میں چڑیا کے بچّوں کے لیے دانہ لے کر جاؤں گا۔"

ماں اُس کی بات سُن کر بہت خوش ہوئی اور اُسے پیار کرتے ہوئے بولی "اچھا، اچھا، ٹھیک ہے۔ پہلے تم خود تو روٹی کھالو۔"

اب چراغ کا معمول بن گیا تھا کہ وہ اسکول جاتا تو گھر سے چڑیا اور اُس کے بچّوں کے لیئے دانہ لے جاتا اور اُسے درخت کے اِرد گرد بکھیر دیتا۔ واپسی پر دانہ زمین پر نہ پاتا تو بہت خوش ہوتا۔ وہ سوچتا کہ چڑیا اور اُس کے بچّے نیچے اُترے ہوں گے اور اُنہوں نے دانہ کھالیا ہو گا۔

دن گزرتے گئے۔ اب کبھی کبھار چڑیا کے بچّے بھی چراغ کی آ آ پر چُوں چُوں کا شور مچاتے اور اپنے ننھّے ننھّے سر باہر نکالتے تو چراغ کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہتا۔

پھر ایک دن جب وہ اسکول سے واپس آ رہا تھا تو اُس نے دیکھا کہ ایک لکڑہارا اُس درخت پر نشان لگا رہا ہے اور گھونسلے کے اندر چڑیا کے بچّے شور مچا رہے ہیں، جیسے کہ رو رہے ہوں "مدد! مدد! مدد!"

اُس نے لکڑہارے سے پوچھا "بابا، تم کیا کر رہے ہو؟"

"اِس درخت کو کاٹنا ہے۔ نشان لگا رہا ہُوں" لکڑہارے نے جواب دیا۔

"مگر کیوں؟" چراغ نے پُوچھا۔

"میں نے یہ درخت خرید لیا ہے۔ اِس کی لکڑی بیچوں گا" لکڑہارے نے جواب دیا۔

"کس سے خریدا ہے تم نے؟" چراغ نے پوچھا۔

"گاؤں کے چودھری سے۔ یہ اُس کی زمین ہے" لکڑہارے نے کہا۔ چراغ کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ چڑیا اور اس کے بچّے تو مر جائیں گے۔ یہی سوچتا ہوا وہ ہانپتا کانپتا گھر آیا۔

"خیریّت تو ہے؟ ٹھیک تو ہو؟" ماں نے پریشانی سے پوچھا۔

"ہاں، میں ٹھیک ہوں۔ مگر چڑیا، اُس کا گھونسلا، اُس کے بچّے" اُس نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

"کیا ہوا اُنہیں؟" ماں نے گھبرا کر کہا "لو، آرام سے بیٹھو اور ساری بات بتاؤ۔"

چراغ نے لکڑہارے والی بات ماں کو بتائی اور پھر بولا "امّاں، چڑیا کے بچّوں کو بچالیں۔ درخت کٹ گیا تو وہ بے چارے نیچے گر کر مر جائیں گے۔"

"تم فکر نہ کرو۔ اللہ سب کا محافظ ہے" ماں نے اُسے تسلّی دی۔

دوسرے دن وہ اسکول جاتے ہوئے اُس درخت کے پاس سے گزرا جس پر چڑیا کا گھونسلا تھا تو گھونسلے میں سے چڑیا اور اُس کے بچّوں کی چُوں چُوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ چراغ یہ دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ مگر جب اُسے درخت کٹنے کا خیال آیا تو غم گین ہو گیا۔

وہ اِن ہی خیالوں میں گُم تھا کہ لکڑہارا کاندھے پر کُلہاڑا

اُٹھائے آتا دکھائی دیا۔ وہ پریشان ہو گیا۔ اُس نے لکڑہارے سے کہا "بابا، کیا تم اِس درخت کو چھوڑ نہیں سکتے؟"

"مگر کیوں؟" لکڑہارے نے اُسے غور سے دیکھتے ہوئے پُوچھا۔

"کوئی اور درخت کاٹ لو" چَراغ نے کہا۔

"مگر میں تو اِس درخت کے پیسے دے چکا ہُوں۔ دوسرا درخت کیسے کاٹوں؟" لکڑہارے نے کہا۔

چَراغ سوچ میں پڑ گیا۔ پھر بولا "اچھّا، بابا، ایک مہربانی کرو۔ کل تک اِس درخت کو نہ کاٹو۔ اگر کل تک میں وہ رقم جو تُم نے چودھری کو دی ہے، تمہیں واپس کر دوں تو یہ درخت میرا ورنہ تم اپنی مرضی کے مالک۔"

لکڑہارا چراغ کی درخواست سُن کر سوچ میں پڑ گیا۔ پھر ہنستا ہوا بولا "تم کہاں سے دو گے اِتنی رقم؟ خیر، چلو، اگر تم ضِد کرتے ہو تو تمہاری خوشی کی خاطر میں یہ درخت دو دن تک نہ

کاٹوں گا۔ مگر تمہیں اِس سے کیا فائدہ ہو گا؟"

چَراغ کہنے لگا "بابا، تم نے وعدہ کیا ہے۔ دو دن تک درخت نہ کاٹنا۔ شکریہ، شکریہ۔" یہ کہہ کر وہ بھاگم بھاگ گھر پہنچا۔

"کیا بات ہے؟ اِسکول نہیں گئے؟" ماں نے پوچھا۔

"کیسے جاتا؟ وہ چڑیا..... گھونسلا..... بچّے.....!" اُس نے پھولی ہوئی سانس سے کہا۔

"تو پھر؟" ماں نے ذرا سختی سے پوچھا۔

"امّاں، میں نے لکڑہارے سے کہا ہے کہ وہ دو دن تک چڑیا کے گھونسلے والا درخت نہ کاٹے اور اُس نے میری بات مان لی ہے۔ مگر اِس کے بعد؟ اِس کے بعد کیا ہو گا.....؟" ابھی وہ بات مکمّل نہ کر پایا تھا کہ اُس کا باپ کرم دین مٹّی میں لت پت اور سر پر جانوروں کے لیے چارے کا گٹھّا اُٹھائے گھر میں داخِل ہُوا۔

"شاباش! بیٹے، شاباش!" کرم دین نے چَراغ کو دیکھ کر کہا "مجھے دکان دار نے بتایا کہ تم نے وظیفے کا اِمتحان نہ صِرف پاس کر لیا ہے بلکہ پُورے ضلع میں اوّل آئے ہو۔ اخبار میں تمہاری فوٹو بھی چھپی ہے۔ اللہ کا کرم ہے۔ شاباش!"

پھر اچانک اُسے کچھ یاد آیا۔ اُس نے پوچھا "مگر تم آج اِسکول کیوں نہیں گئے؟"

تب اُس کی بیوی نے چَراغ کی زبانی سُنی ہوئی چڑیا کے گھونسلے کی ساری کہانی اُسے کہہ سُنائی۔

کرم دین بہُت خوش ہوا۔ "شاباش! بیٹے" اُس نے چراغ کا سر تھپ تھپایا "کوئی بات نہیں۔ ہم ابھی چودھری کے پاس چلتے ہیں، جس نے یہ درخت بیچا ہے۔"

تھوڑی دیر بعد چراغ اور اُس کا باپ چودھری کی حویلی میں پہنچے۔ وہ کرم دین کو دیکھ کر بہُت حیران ہوا، کیوں کہ زمین کے مُعاملے میں اِن دونوں کے درمیان کافی دِنوں سے جھگڑا چل رہا تھا۔ اُس نے کہا "ارے کرم دین! میں یہ کیا دیکھ رہا ہوں؟"

"یہ آپ کا بھتیجا چراغ مجھے یہاں لایا ہے۔ آپ سے کچھ کہنا بلکہ مانگنا چاہتا ہے" کرم دین نے جواب دیا۔

چودھری ایک دم نرم پڑ گیا۔ اُس نے چراغ سے کہا "جی بیٹے، حکم؟ کیا چاہیے تمہیں؟"

"تایا جان، آپ نے کھیتوں والے درخت کیوں بیچے؟" چَراغ نے کہا۔

"بیٹے، کچھ رقم کی ضرورت تھی۔ مگر تم کیوں پوچھ رہے ہو؟" چودھری نے کہا۔

"یہ میں آپ کو بعد میں بتاؤں گا۔ آپ ایسا کریں کہ اُن درختوں میں سے ایک درخت کی قیمت اُس لکڑہارے کو واپس کر دیں۔ وہ درخت میں خرید لوں گا۔"

"مگر بیٹے، تم اُس کا کیا کرو گے؟ تمہارے بابا کی زمین پر تو خود بہت سارے درخت ہیں" چودھری بولا۔

"بس تایا جان، آپ وہ مجھے دے دیں اور قیمت لے لیں" چراغ نے درخواست کی اور ساتھ ہی اپنا مٹی کا گلّا چودھری کی طرف بڑھا دیا۔

"یہ کیا ہے، بیٹے؟" چودھری نے پوچھا۔

"تایا جان، یہ میرا گلّا ہے۔ اِس میں سے جتنی رقم نکلے، رکھ لیں۔ باقی رقم میں قسطوں میں ادا کر دوں گا" چَراغ نے سنجیدگی سے کہا۔

اب چودھری نے محسوس کیا کہ اِس درخت میں ضرور کوئی خاص بات ہے جو یہ معصوم بچّہ اِتنا اِصرار کر رہا ہے۔ اُس نے کرم دین سے کہا "بھائی کرم دین، چَراغ کیا کہہ رہا ہے؟"

کرم دین نے جواب دیا "یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔"

یہ کہہ کر اُس نے چڑیا اور اُس کے بچّوں کی کہانی چودھری کو کہہ سُنائی۔ چودھری کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ چراغ کی رحم دلی اور ایثار سے بہت مُتأثّر ہوا۔ بولا "بیٹے، ہم نے تمہاری بات مان لی۔ اس درخت پر جب تک چڑیا کا گھونسلا ہے، وہ نہیں کٹے گا۔ یہ ہمارا وعدہ ہے۔"

عمران عالی شان

عمران خان پاکستان کی طرف سے 88 ٹسٹ میچ کھیل چکے ہیں۔ ان میں اُنہوں نے 3,807 رن بنائے، جن میں 6 سنچریاں اور 18 نصف سنچریاں شامل ہیں۔ جہاں تک اُن کی بالنگ کا تعلّق ہے، وہ اب تک 19,458 گیندیں کر چکے ہیں جن میں 724 میڈن رہیں اور اُنہوں نے 362 وکٹیں لے کر 8,259 رن دیے۔ یعنی ایک وکٹ کے عوض 22.81 رن۔ اُنہوں نے 23 موقعوں پر ایک اِننگز میں کم از کم پانچ وکٹیں اور 6 موقعوں پر ایک میچ میں کم سے کم 10 وکٹیں لیں۔ ایک موقع پر اُنہوں نے صرف 58 رن دے کر 8 وکٹیں گرائیں۔ یہ اُن کی بہترین بالنگ تھی۔

عمران خان نے 48 ٹسٹ میچوں میں پاکستانی ٹیم کی کپتانی کی اور اِن میں سے 12 میچ جیتے، آٹھ ہارے 28 میں ہار جیت کا فیصلہ نہ ہو سکا۔

ٹسٹ ریکارڈ کی طرح عمران خان کا ون ڈے ریکارڈ بھی بہت شان دار ہے۔ اُنہوں نے 175 ایک روزہ میچ کھیلے۔ 151 اِننگز میں بیٹنگ کی اور 33.41 فی میچ کے حساب سے 3,709 رن بنائے۔ ایک موقع پر وہ 102 رن بنا کر ناٹ آؤٹ رہے۔ ون ڈے میچوں میں یہ اُن کی واحد سنچری ہے۔ اُنہوں نے 19 میچوں میں 50 سے زائد نصف سنچریاں بنائیں۔

اُنہوں نے 7,461 گیندیں کیں جن میں سے 123 میڈن رہیں۔ اُنہوں نے 4,845 رن دے کر 182 وکٹیں گرائیں۔ ایک موقع پر اُنہوں نے صرف 14 رن دے کر بھارت کے 6 کھلاڑی آؤٹ کیے۔ یہ اُن کی بہترین کارکردگی تھی۔

عزم و ہمت کی حیرت انگیز داستانیں

مقبول انور داؤدی

عزّالدین افغانستان کے ایک علاقے غور کے حاکم قطب الدین حسین کا پوتا تھا۔ جب ایک جنگ میں قطب الدین مارا گیا، تو اس کا بیٹا اپنے بچّے عزّالدین کو لے کر چھپتا چھپاتا ہندوستان چلا آیا۔

ہندوستان میں اُس نے تجارت شروع کر دی، جس سے وہ بہت امیر ہو گیا۔ جب اُس کے پاس کافی دولت جمع ہو گئی تو اُس نے وطن واپس جانے کا ارادہ کیا۔ لیکن اُسے ڈر تھا کہ خشکی کے راستے جاتے ہوئے کہیں دشمنوں کے ہتھے نہ چڑھ جائے۔

چُناں چہ اُس نے سمندر کے ذریعے سفر کرنے کا فیصلہ کیا اور ایک چھوٹے سے جہاز میں سوار ہو کر روانہ ہوا۔ بدقسمتی سے جہاز غرق ہو گیا۔ عزّالدین کا باپ تو سمندر کی لہروں کے سپرد ہو گیا، لیکن عزّالدین کو جہاز کا ایک ایسا تختہ مل گیا جس پر ایک شیر بیٹھا ہوا تھا۔

آخر ایک رات وہ تختہ ایک ساحل کے ساتھ جا لگا۔ شیر چھلانگ لگا کر بھاگ گیا اور عزّالدین کو قریب ہی ایک ٹمٹماتی ہوئی روشنی نظر پڑی۔ یہ ایک شہر تھا جس کے دروازے بند ہو چکے تھے۔ وہ بے بس ہو کر دروازے کی دیوار کے ساتھ لیٹ گیا۔

کچھ دیر کے بعد اُدھر سے گشت کرنے والے سپاہی کا گزر ہوا جس نے اُسے چور سمجھ کر گرفتار کر لیا اور جیل خانے بھیج دیا سات سال بعد اُس کو جیل سے رہائی نصیب ہوئی۔ رہائی کے بعد وہ غزنی (افغانستان) کی طرف چل دیا۔ راستہ طویل اور کٹھن تھا۔ بہرحال، وہ چلا جا رہا تھا کہ ایک جگہ اُسے ڈاکوؤں نے پکڑ لیا اور تنومند نوجوان دیکھ کر اپنے گروہ میں شامل کر لیا۔

اُسی رات غزنی کے بادشاہ ابراہیم کی فوج نے ڈاکوؤں کے گرد گھیرا ڈال کر سب کو گرفتار کر لیا اور زنجیروں میں باندھ کر دارالحکومت میں لے گئی۔ یہاں اُن پر مقدّمہ چلایا گیا اور عدالت نے اُن کو سزائے موت کا حکم دیا۔

جب جلّاد عزّالدین کی آنکھوں پر پٹّی باندھ رہا تھا تو اُس نے اللہ کی بارگاہ میں گڑگڑا کر عرض کی کہ اے مولا! تو جانتا ہے کہ میں بالکل بے گناہ ہوں۔ آخر کس گناہ کے بدلے میں مجھے یہ سزا مل رہی ہے؟

جلّاد نے اُس کی دُعا سُنی تو اُس کا دل پسیج گیا۔ اُس نے عدالت کے اُس بڑے افسر کو جو اُس وقت موجود تھا، اِس واقعے کی خبر دی۔ اُس نے عزّالدین کو بُلا کر تمام کہانی سُنی اور پھر بادشاہ سے درخواست کی کہ وہ خود مُلزِم کا بیان سُننے کے بعد فیصلہ کرے۔

عزّالدین کو سُلطان کے سامنے پیش کیا گیا۔ عزّالدین نے اُسے اپنی کہانی سُنائی تو وہ بہت خوش ہوا اور اُس کی سزا مُعاف کر کے اُسے اپنی مُلازمت میں لے لیا۔ کچھ مُدّت کے

بعد سلطان نے اُسے اپنے دربانوں کا سردار مقرر کر دیا۔ عزّ الدّین نے اپنی علمی قابلیّت اور وفاداری کے باعث سلطان کے دل میں گھر کر لیا اور سلطان نے اپنی لڑکی کی اُس سے شادی کر دی۔ اچھے کام کی وجہ سے عزّالدّین کی عزّت روز بروز بڑھتی ہی گئی۔ یہاں تک کہ سلطان ابراہیم کے بیٹے سلطان مسعود کی حکومت میں اُسے غور کا حاکم مقرر کر دیا گیا۔

عزّالدّین کی وفات کے بعد اُس کے بیٹے بہمن اور غور کی سلطنت کے بانی ہوئے۔

یوسُف ترکی کے سلطان محمّد دوم کا بیٹا تھا۔ بدقسمتی سے اُس کی حکومت کا تختہ اُلٹ گیا۔ نئے حاکم نے اپنے وزیروں کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے حکم دیا کہ سابق سلطان کے خاندان کے تمام مردوں کو قتل کر دیا جائے تاکہ تخت کا کوئی وارث نہ رہے۔

یوسُف ابھی بچّہ ہی تھا۔ ماں کی ممتا چاہتی تھی کہ اُس کا بچّہ زندہ رہے خواہ کسی حال میں رہے۔ وہ اپنے بچّے کو چھپائے ہوئے تھی۔ آخر اُس نے بڑی کوشش اور بے اندازہ روپیہ خرچ کرنے کے بعد یوسُف کی عمر کا ایک غلام بچّہ خرید لیا جس سے یوسُف کی شکل ملتی جلتی تھی۔ یہ سارا کام اُس نے وزیر اور جلاّد کے آنے سے پہلے ہی کر لیا تھا۔

اُس نے اپنے بیٹے یوسُف کو ایک بہت بڑے تاجر خواجہ اِمدادُالدّین کے سپرد کر دیا اور بہت سی دولت اور ہیرے جواہرات دے کر اُس سے درخواست کی کہ اُس کے بچّے کو اِس حکومت کی حدُود سے باہر کسی محفوظ مقام پر پہنچا دے۔ خواجہ اِمدادُالدّین بچّے اور مال و دولت کو لے کر شہر سے نکل گیا۔

اگلے روز جب وزیر اور جلاّد محل میں آئے اور شہزادے کا مطالبہ کیا تو ملکہ نے اُس غلام بچّے کو اُن کے حوالے کر دیا اور روتے ہوئے کہا کہ یہ ہے میرا فرزند۔ وزیر اور جلاّد بچّے کو اُٹھا کر لے گئے۔

خواجہ اِمدادُالدّین شہزادے کو اردبیل لے گیا اور وہاں ایک بزرگ کے سپرد کر دیا۔ لیکن کچھ مدّت کے بعد جب قدرے اطمینان ہو گیا تو خواجہ شہزادے کو واپس شہر لے آیا اور اپنے بچّوں کے ساتھ اُس کی تعلیم و تربیت کرنے لگا۔ شہزادہ اب سات سال کا ہو گیا تھا۔ ایک دفعہ ملکہ نے ایک معتبر آدمی کو شہزادے کے حالات معلوم کرنے کے لیے خواجہ کے شہر میں بھیجا۔ اُس وقت شہزادہ اِس بات سے واقف ہو چکا تھا کہ وہ کون ہے۔ شہزادے نے اپنے ہاتھ سے اپنی ماں کو خط لکھا۔ ملکہ بیٹے کا خط پا کر بہت خوش ہوئی اور اُس نے غریبوں میں بہت سا روپیہ خیرات کیا۔

شہزادہ یوسُف اب سولہ سال کا ہو چکا تھا۔ ہوتے ہوتے کسی کو پتا چل گیا کہ یہ شہزادہ یوسُف ہے۔ اُس نے گورنر کو اِس کی اطّلاع دی۔ گورنر شریف اِنسان تھا۔ اُس نے شہزادے سے کہا کہ اِس سے پہلے کہ سلطان کو تمہارے یہاں آنے کی اطّلاع ملے تم کسی محفوظ مقام پر چلے جاؤ۔

یہاں سے یوسُف قم پہنچا۔ قم سے کاشان، کاشان سے اِصفہان اور اِصفہان سے شیراز پہنچا۔ کچھ عرصہ شیراز میں قیام کرنے کے بعد وہ خلیج فارس کے ساحل پر پہنچ گیا اور ایک جہاز میں سوار ہو کر دیبل پہنچ گیا۔ یہاں اُس کی واقفیّت خواجہ محمود گورجستانی سے ہو گئی جو یہاں کاروبار کے سلسلے میں آیا ہوا تھا۔ یوسُف کی اچھّی عادات و اطوار اور اُس کی غریبُ الوطنی کو دیکھ کر خواجہ اُسے اپنے ساتھ ہی ہندوستان کے ایک شہر احمد آباد بیدر لے آیا۔

احمد آباد بیدر میں پہنچ کر خواجہ نے یوسُف کو خواجہ محمود گاواں وزیر کے ہاتھ بیچ دیا۔ خواجہ محمود گاواں نے اُسے شاہی محافظ دستے میں نوکر کر لیا۔ اپنی قابلیّت، لیاقت اور محنت سے یوسُف بڑھتے بڑھتے پانچ سو سواروں کا سردار بن گیا اور اُسے عادل خاں کا خطاب ملا۔

جب محمود شاہ فوت ہوا تو دارُالحکومت میں بدنظمی پھیل گئی۔ یوسُف عادل خاں نے اِس موقع کو غنیمت جانا اور کچھ افسروں اور فوجیوں کو اپنے ساتھ ملا کر احمد آباد بیدر پر قبضہ کر لیا۔ اِس کے بعد اُس نے بیجاپور کو فتح کر کے بیجاپور میں عادل شاہی حکومت کی بُنیاد رکھی۔

گھونا ضلع سیال کوٹ کا سرحدی گاؤں ہے۔ گاؤں کے تقریباً سب لوگ کھیتی باڑی کرتے ہیں۔ ہر خاندان کی اپنی زمین کم از کم اِتنی ضرور ہے جس سے اُس کا اپنا پیٹ با آسانی بھر سکتا ہے۔ گاؤں کے گرد ایک وسیع رقبہ شاملاتی زمین پر بھی مشتمل ہے جس میں چھوٹے چھوٹے ٹیلے، فوجیوں کے مورچے اور چھوٹی چھوٹی پُختہ دیواریں ہیں۔ اِس کے علاوہ درختوں کے جُھنڈ اور گھنی جھاڑیاں بھی ہیں جو شاید خود اُگائی گئی ہیں۔ اِن کے بیچوں بیچ کئی پُختہ کُنوئیں بھی ہیں جو شاید جنگ کے زمانے میں پینے کا پانی حاصل کرنے کی غرض سے کھودے گئے ہوں گے۔ یہ کنوئیں عام حالات میں اِستعمال نہیں ہوتے، اِس لیے اِن کو بھی خود رَو جڑی بُوٹیوں اور جھاڑیوں نے ڈھانپا ہُوا ہے۔

انور خاں اِس علاقے کا سب سے امیر شخص تھا۔ گاؤں سے ایک کچّی لیکن قدرے بہتر سڑک اُس کے اِنجن کی طرف جاتی تھی جو اُس نے اپنی زمینوں میں لگا رکھا تھا۔ مرچیں پِسوانا ہوں یا گندم، چاول چھڑوانا ہوں یا رُوئی دُھنکوانا، لکڑیاں چِروانا ہوں یا سرسوں کا تیل نکلوانا، سب لوگ انور خاں کے اِس اِنجن کی طرف ہی رجوع کرتے۔ سارا سارا دن نہ ختم ہونے والا یہ ہجُوم انور خاں کے اِنجن پر لگا رہتا۔

انور خاں جیسا با اَخلاق اور محنتی اِنسان علاقے بھر میں اور کوئی نہ تھا۔ وہ خود تو تعلیم حاصل نہ کر سکا تھا لیکن اپنے اِکلوتے بیٹے سُہیل کو اعلیٰ تعلیم دلوانا چاہتا تھا۔ مگر سُہیل کو پڑھنے لکھنے سے دل چسپی نہ تھی۔ اللہ تعالیٰ اگر کسی شخص کو دُنیا کی نِعمتوں سے نوازتا ہے تو کوئی ایسا دُکھ اُسے ضرور لگا دیتا ہے جس سے وہ اپنے رب کو نہ بھُولنے پائے۔ اگر ایسا نہ ہو تو اچّھے بھلے اِنسان کو فرعون بنتے دیر نہیں لگتی۔ سُہیل بھی انور کے لیے ایسا ہی ایک دُکھ تھا۔

وہ اب دسویں جماعت میں پہنچ گیا تھا۔ لیکن دولت کے نشے میں بدمست اِس اُونٹ کی کوئی کَل سیدھی نہ تھی۔ اُس کی

نظروں میں اُس کے باپ کی حیثیّت محض نوٹ چھاپنے والی مشین کی سی تھی۔ والِدہ کو تو وہ گھر کی لونڈی سمجھتا۔ وہ جب اِسکول کی دیواروں پر لکھے ہوئے نصیحت آموز فِقرے اور شعر پڑھتا تو اُن کا مذاق اُڑاتا۔ گالی گلوچ اور جھوٹ کے عِلاوہ چوری بھی کر لیتا۔ گلی کے نُکڑ پر کھڑے ہو کر ہر گزرنے والے کا مذاق اُڑانا اُس کا روزانہ کا معمول بن چکا تھا۔ کُتّے، کبوتر، طوطے، بٹیر غرض کون سا جانور ہو گا جو سُہیل نے نہ پال رکھا ہو۔ اُس کی اِن حرکتوں نے نہ صرف انور خاں کا ناک میں دم کر رکھا بلکہ سارا گاؤں تنگ تھا۔

اِسکول میں سر سلیم کے پیریڈ کے 45 منٹ کے عِلاوہ مجال ہے جو سُہیل نے ایک مِنٹ بھی کتابوں کو ہاتھ لگایا ہو۔ سلیم صاحِب کے پیریڈ کا تو ایک ایک منٹ سونے میں تولنے کے قابل تھا۔ اِسلامیات کے اِس پیریڈ میں اُن کے زبردست کنٹرول کی وجہ سے تمام کلاس حاضر ہوتی اور اُن کا لیکچر بڑے غور سے سُنتی۔ اِس قدر مُؤثّر لیکچر دیتے کہ سب کو ہلا کر رکھ دیتے۔ لیکن سہیل پر اُن کی باتوں کا بھی کوئی اثر نہ ہوتا۔ ایک کان سے سُنتا اور دوسرے کان سے نکال دیتا۔

سرحدی گاؤں کا یہ ہائی اِسکول گاؤں سے تقریباً تین میل کے فاصلے پر تھا، اور یہ تین میل کا عِلاقہ اِس صحرا نُما شاملاتی زمین پر مُشتمل تھا جس کا ذکر کہانی کے شروع میں آیا ہے۔ یعنی اِس میں مورچے، کُنوئیں، درخت اور جھاڑیاں تھیں۔ آج صبح سے ہی کالی گھٹاؤں نے آسمان پر ڈیرے ڈالے ہوئے تھے۔ تیز آندھی اور جھکڑ چلنے کے آثار محسوس ہو رہے تھے۔ گاؤں کے سب طالبِ عِلم سلیم صاحِب کے پیریڈ میں ہر صورت شامل ہونا چاہتے تھے۔ انور خاں نے جب گاؤں کے دس پندرہ لڑکوں کو اِسکول جاتے ہوئے دیکھا تو آندھی کے آثار کے باوجود سُہیل کو اِسکول جانے کی اِجازت دے دی۔

سلیم صاحِب کا آج کا لیکچر "طُوفانِ نوح" کے اَسباب" پر تھا۔ وہ کہہ رہے تھے کہ "تاریخ میں بہُت سے ایسے واقعات ملتے ہیں کہ جب اِنسان خدا کی نافرمانی میں حد سے بڑھ گئے تو اُنہیں کسی نہ کسی طوفان نے گھیر لیا۔ پھر جب اُنہیں موت سامنے نظر آئی تو اُنہوں نے مُہلت مانگی کہ اِس دفعہ بچ گئے تو آیندہ کبھی خدا کی نافرمانی نہیں کریں گے۔ لیکن گیا وقت کب واپس آتا ہے۔"

سُہیل اُن کی باتوں پر قطعاً دھیان نہیں دے رہا تھا۔ اُس نے 45 مِنٹ کا یہ پیریڈ چار و ناچار پورا کیا اور پھر گھر کی طرف دوڑ لگا دی۔ کیوں کہ آج اُس کا چندی کے ساتھ کبوتر بازی کا مقابلہ تھا اور اُسے اپنے خمرے کبوتروں پر بڑا مان تھا۔ اُسے یقین تھا کہ وہ ضرور جیت جائیں گے۔ باقی سب لڑکے بقیہ پیریڈ پڑھنے میں مصروف تھے اور سُہیل تنِ تنہا گاؤں واپس جا رہا تھا۔ وہ پہلے بھی اکثر وقت سے پہلے ہی اِسکول سے نکل آیا کرتا تھا مگر آج اُسے اکیلے آنا مہنگا پڑا۔ آندھی تو اِسکول سے نکلتے ہی شروع ہو چکی تھی، لیکن جب وہ آدھے راستے میں پہنچا تو زبردست طوفان نے اُسے گھیر لیا۔ تیز ہوا کے چلنے سے خوف ناک آوازیں پیدا ہو رہی تھیں۔ ریت کے ٹیلوں سے ریت اُڑ اُڑ کر سارے جنگل کو گرد آلود کر رہی تھی۔ کالی گھٹاؤں کی وجہ سے دن کے باوجود اندھیرا چھا گیا تھا۔

سُہیل کو سلیم صاحِب کے لیکچر کے کچھ کچھ الفاظ یاد آ رہے تھے۔ اِس لیے اُس کا دل اِس طوفان سے دہل جاتا لیکن دوسرے ہی لمحے وہ جی کڑا کر کے گھر کی طرف دوڑنے لگتا۔ اُس نے جلدی گھر پہنچنے کے لیے اصل راستہ چھوڑ کر شارٹ کٹ اپنا لیا۔ وہ اِس اَن دیکھے راستے پر تھوڑی دور ہی چلا تھا کہ بے خیالی میں ایک کُنوئیں میں جا گرا۔

قدرت نے زندگی اور موت کو قریب سے دیکھنے کے لیے اُسے چند منٹ کی مُہلت عطا کر دی تھی۔ کُنوئیں پر چرخی لگی ہوئی تھی جس کے ساتھ رسّی لٹک رہی تھی۔ البتّہ رسّی میں ڈول نہ تھا۔ رسّی نیچے پانی تک پہنچ رہی تھی۔ سُہیل نے نیچے گرتے ہی ہاتھ پاؤں مارنے شروع کر دیے۔ چند لمحوں بعد اُس کے ہاتھ میں رسّی آ گئی۔ اُسے پکڑ کر اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ دُنیا جہان کی سب چیزوں سے قیمتی چیز ہے۔ اب وہ

کسی غیبی طاقت کی مدد کا مُنتظر تھا۔ اُسے یہ اِحساس بار بار پریشان کر رہا تھا کہ جب اُس کے ہاتھ تھک جائیں گے تو وہ پانی کی اتھاہ گہرائیوں میں گُم ہو جائے گا۔

اُسے آج سلیم صاحب کے لیکچر بھی یاد آ رہے تھے، اور وہ سب اَقوال بھی جو اِسکول کی دیواروں پر لکھے ہوئے تھے۔ لیکن اب تو زندگی موت کے دروازے پر کھڑی دستک دے رہی تھی۔

اُسے محسوس ہو رہا تھا جیسے زمانہ اُس سے اِس قدر اُکتا چکا تھا کہ اُس کے کفن دفن اور نمازِ جنازہ کی تکلیف بھی برداشت کرنے کو تیار نہ تھا۔ تبھی تو یہ کُنواں اُس کی قبر بنا تھا۔ اُسے دوزخ کی ہول ناک آگ اور خدا کے عذاب کا اِحساس مُسلسل ڈس رہا تھا۔ اُسے جب گاؤں کے غریب کرمُو کی ٹانگیں توڑنے والا واقعہ یاد آیا تو اپنے اِس ظُلم کا خیال آتے ہی اُس کی چیخ نکل گئی، رسّی ہاتھوں سے چھوٹ گئی اور وہ پانی میں ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔

خوش قسمتی سے اُس کی چیخ کو گشت پر نکلے ہوئے ایک فوجی نے سُن لیا۔ وہ فوراً چوکنا ہوا۔ پھر دوسرے ہی لمحے اُس نے کُنویں میں جھانکا تو اُسے محسوس ہوا کہ کوئی شخص پانی میں ہاتھ پاؤں مار رہا ہے۔ فوجی چلّایا "شاباش! جوان! رسّی پکڑنے کی کوشش کرو۔ یہ لو۔ بالکل تمہارے ہاتھ کے قریب ہے۔ پکڑ لو اِسے۔"

سہیل ڈوبتے ڈوبتے ایک بار پھر رسّی پکڑنے میں کام یاب ہو گیا۔ فوجی جوان نے جب چرخی کو آہستہ آہستہ گھمانا شروع کیا تو کنارے پر آ کر سُہیل کے رہے سہے اَوسان بھی جواب دے گئے۔ فوجی جوان نے ایک ہاتھ چرخی پر رکھا اور دوسرے سے لپک کر سہیل کو پکڑ لیا۔

اب سُہیل کی زندگی کا نقشہ ہی بدل چکا تھا۔ لوگ کہتے کہ نہ جانے اِس کی زندگی میں کس طرح یہ اِنقلاب برپا ہو گیا ہے۔ سب ہی تو حیران تھے۔ لیکن سہیل جب بھی کسی بُرے آدمی کو دیکھتا تو وہ کہتا کہ کاش! یہ بھی میری طرح موت کے دروازے پر دستک دے کر لوٹا ہوتا۔

پاکستان کے پہاڑ

اکثر بچّے چھٹیاں گزارنے مری، ایبٹ آباد، کوئٹہ، زیارت، وادیِ کاغان، وادیِ سوات وغیرہ جاتے ہیں۔ یہ مقامات پہاڑوں پر ہی واقع ہیں۔

پاکستان کے نقشے پر نظر ڈالیں تو آپ کو بعض جگہ گہرا بھورا رنگ اور بعض جگہ ہلکا بھورا رنگ نظر آئے گا اور کہیں کہیں اِنہی رنگوں میں سفید اور ہلکا بیگنی رنگ ہو گا اور یہ سب رنگ آپس میں گڈمڈ بھی دکھائی دیں گے۔ یہ رنگ پہاڑوں کی نشان دہی کرتے ہیں اور اِنہی رنگوں سے پہاڑوں کی اُونچائی اور نیچائی بھی معلوم ہوتی ہے۔

مری، ایبٹ آباد، وادیِ کاغان وغیرہ جن پہاڑوں پر واقع ہیں اُنھیں ہِمالیہ کے سِلسِلے کہا جاتا ہے۔ یہ دُنیا کے بلند ترین پہاڑ ہیں اور پاکستان کے شمال میں واقع ہیں۔ اِن پہاڑوں کا سِلسِلہ کشمیر سے ہوتا ہُوا نیپال، بھوٹان اور بھارت کے صوبہ آسام تک چلا گیا ہے جو تقریباً دو ہزار میل لمبا ہے اور اِن میں دنیا کی بلند ترین چوٹیاں واقع ہیں۔

نیپال اور چین کی سرحد پر دنیا کی سب سے بلند چوٹی ماؤنٹ ایورسٹ واقع ہے جو تقریباً 29028 فٹ بلند ہے۔ اِسی طرح دنیا کی دوسری بلند ترین چوٹی ماؤنٹ گوڈ وین آسٹن یا K-2 پاکستان میں واقع ہے، جو 28250 فٹ بلند ہے۔

ہِمالیہ کے شمال میں کوہِ قراقرم ہے جس میں درّہ خنجراب واقع ہے۔ یہ درّہ تقریباً 16000 فٹ کی بلندی پر ہے۔ اِسی درّے میں سے شاہراہِ قراقرم یا شاہراہِ ریشم بھی گزرتی ہے جو پاکستان اور چین کو ملاتی ہے۔ مارکوپولو انہی پہاڑوں میں سے گزر کر چین گیا تھا۔ شاہراہِ قراقرم دنیا کا آٹھواں عجوبہ اور پاکستانیوں کے عزم و ہمّت کا شاہکار بھی ہے۔

شاہراہِ قراقرم دریائے سندھ کے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ اِس پر گلگت آنے سے قبل، آپ ایک اور بلند چوٹی نانگا پربت اور گلگت سے راکاپوشی کا نظارہ کر سکتے ہیں۔ یہ سب چوٹیاں ہمیشہ برف سے ڈھکی رہتی ہیں۔

آپ مری گئے ہوں گے۔ مری، پٹریاٹہ، ایوبیہ، گھوڑا گلی، نتھیا گلی، ایبٹ آباد وغیرہ ہِمالیہ پر ہی واقع ہیں۔ یہ نہایت حسین اور دلکش مقامات ہیں۔ اور وادیِ کاغان کا تو کوئی جواب ہی نہیں۔ اِس خوبصورت وادی کو دریائے کنہار نے بنایا ہے۔ اِس کے دونوں طرف بلند و بالا پہاڑ ہیں۔ اِنہی پہاڑوں میں جھیل سیفُ المُلوک ہے۔ جھیل کے اطراف کے پہاڑ ہمیشہ برف سے ڈھکے رہتے ہیں۔ اِسی جھیل سے دریائے

کنہار نکل کر وادیِ کاغان میں بہتا ہے۔ یہ خوبصورت وادی بالا کوٹ سے درہ بابوسر تک چلی گئی ہے۔ ساری دنیا سے ہزاروں سیّاح یہاں سیر و تفریح کے لیے آتے ہیں اور اِس وادی کی خوبصورتی اور دلکشی سے لُطف اُٹھاتے ہیں۔

ہمارے بڑے اور مشہور دریا، دریائے سندھ، جہلم، چناب، راوی اور ستلج بھی اِنہی پہاڑوں سے نکلے ہیں۔

کوہِ قراقرم کے مغرب میں پہاڑوں کا ایک اور سِلسلہ ہے جو کوہِ ہندوکش کہلاتا ہے۔ اِن پہاڑوں کی سب سے بلند چوٹی ترچ میر ہے جو 25,230 فٹ بلند ہے۔ کوہِ ہندوکش سے بعض پہاڑی سلسلے جنوب کی طرف نکل کر پھیلتے چلے گئے ہیں

جن کے درمیان سوات، چترال اور دیر کی خوبصورت وادیاں ہیں۔ یہ بھی نہایت خوبصورت اور دلکش تفریح گاہیں ہیں۔ ہر سال ہزاروں سیّاح ان وادیوں میں بھی سیر و تفریح کے لیے آتے ہیں۔ وادیِ سوات میں منگورہ، مدائن اور کلام نہایت حسین اور خوبصورت مقامات ہیں۔

ہندوکش کے جنوب مغرب میں کوہِ سفید اور وزیرستان کے پہاڑ ہیں۔ یہ پہاڑ پڑوسی ملک افغانستان اور پاکستان کی سرحد پر ہیں۔ یہ زیادہ بلند نہیں ہیں۔ اِنہی میں درۂ خیبر ہے۔ درہ خیبر سے سڑک اور ریل کی لائین لنڈی کوتل ہو کر لنڈی خانہ تک اور سڑک تورخم سے ہو کر کابُل تک گئی ہے۔ تورخم پاکستان کی آخری سرحدی چوٹی ہے۔

درۂ خیبر میں سب سے بلند مقام "شاہ گئی" ہے جو تقریباً 5,000 فٹ بلند ہے۔ دریائے کابُل اِن پہاڑوں میں سے نکل کر بہتا ہے۔ اور اِنہی پہاڑوں کے ایک بلند مقام وارسک پر وارسک ڈیم بنایا گیا ہے۔

کوہِ سفید کے جنوب میں (وزیرستان کے پہاڑوں میں) کُرم، ٹوچی اور گومل چھوٹے چھوٹے درّے ہیں جو اِنہی نام کے دریاؤں نے بنائے ہیں۔ پاراچنار کی خوبصورت وادی بھی وزیرستان کے پہاڑوں ہی میں واقع ہے۔

پنجاب اور شمالی بلوچستان کی سرحد پر کوہِ سُلیمان کے پہاڑی

سلسلے ہیں۔ یہ سلسلے دریائے گومل سے شروع ہو کر جنوب مغرب میں کوئٹے تک پھیلتے چلے گئے ہیں۔ یہاں سب سے بلند چوٹی تختِ سلیمان ہے جو 11000 فٹ بلند ہے۔ یہ ڈیرہ اسماعیل خان سے دیکھی جا سکتی ہے۔ فورٹ مُنرو پہاڑی مقام ہے۔ کوئٹے کے قریب "درۂ بولان" ہے جس میں سے گزر کر ریل کی لائین اور سڑک کوئٹہ جاتی ہے۔

بالکل جنوب میں بلوچستان اور صوبہ سندھ کی سرحد پر کوہ کرتھر کا سلسلہ کراچی تک چلا گیا ہے۔ یہ پہاڑی سِلسلہ سندھ میں "محال کوہستان" کہلاتا ہے اور کراچی میں اسے "پب" کی پہاڑیاں کہتے ہیں۔ اِن میں سے بلند چوٹی

"کُتے جی قبر" ہے جو تقریباً 6,800 فٹ بلند ہے۔ یہ لاڑکانہ شہر سے تقریباً 50 میل کے فاصلے پر شمال مغرب میں واقع ہے۔

بلوچستان سطحِ مُرتفع یا پلیٹو (ایک بہُت بڑا اور بلند پہاڑی میدان) ہے۔اِس میدان میں کہیں پہاڑیاں، کہیں وادیاں، کہیں ریت کے تودے اور ریتلے میدان پائے جاتے ہیں اور کہیں چھوٹے چھوٹے خشک دریا ملتے ہیں۔ بعض دریا پانی کی کمی کی وجہ سے سمندر تک نہیں پہنچ پاتے اور خشک میدان میں غائب ہو جاتے ہیں۔ایسا ہی ایک دریا، دریائے بولان ہے۔

یہ پہاڑی میدان شمال میں افغانستان اور مغرب میں ایران تک چلا گیا ہے اور جنوب میں بحیرۂ عرب کے ساحل پر ختم ہوتا

ہے۔ اِس کے مشرق میں کوہ کرتھر ہے۔

شمال میں افغانستان کی سرحد پر چمن کا قصبہ ہے۔ یہاں کوئٹے سے ایک ریل کی لائن آتی ہے۔ یہ لائن ایک پہاڑی سُرنگ میں سے گزرتی ہے جو "کھوجک ٹنل" کہلاتی ہے۔ آپ کی دلچسپی کے لیے بتادوں کہ ہمارے پانچ روپے کے نوٹ پر اِسی سُرنگ کی تصویر ہے۔

کوئٹے کے شمال مشرق میں 75 میل کے فاصلے پر ایک بلند اور پُرفضا پہاڑی مقام "زیارت" ہے جو 8000 فٹ بلند ہے۔ اِسی مقام پر قائدِاعظم نے اپنی زندگی کے آخری دن گزارے تھے۔ یہاں پنسل بنانے کی لکڑی کے درخت "جونیپر" اور چلغوزہ کے درختوں کے جنگلات پائے جاتے ہیں۔ زیارت کے شمال میں ژوب یا فورٹ سنڈیمن ہے۔

مغرب میں ایران کی سرحد تک ریلوے لائن اور سڑک جاتی ہے۔ سڑک اور ریلوے لائن جن علاقوں سے گزرتی ہے اِن میں چھوٹی چھوٹی بنجر پہاڑیاں، ریتلے اور چٹیل میدان اور کہیں دلدلی زمین ملتی ہے۔

جنوب میں بحیرۂ عرب کے ساحل پر گوادر، پسنی اور سونمیانی کی بندرگاہیں ہیں، جن سے مچھلی کی تجارت ہوتی ہے۔ اس پلیٹو میں چھوٹے چھوٹے پہاڑی سلسلوں کے درمیان قلات، مستونگ، خضدار اور لسبیلہ کے شہر آباد

ہیں۔

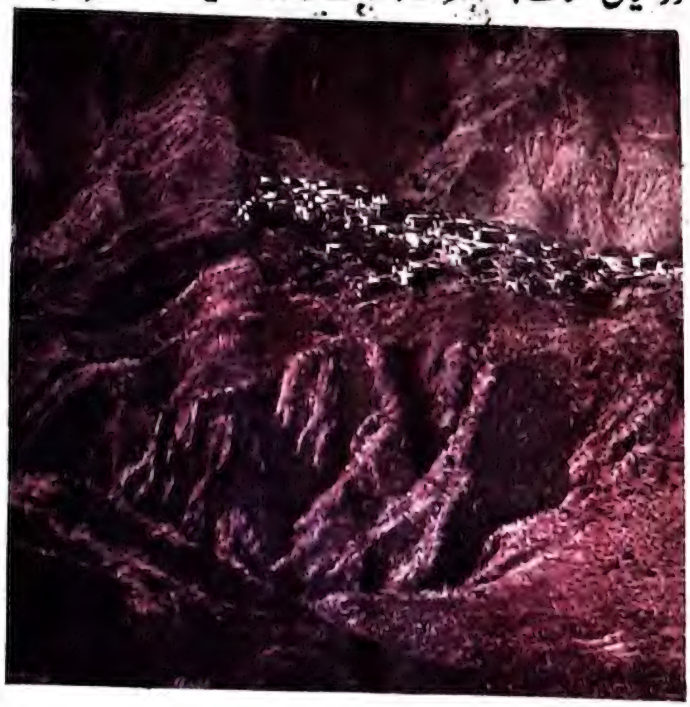

اب ایک اور پہاڑی سلسلے کا حال سُنیے۔ آپ راولپنڈی، اسلام آباد یا مری تو گئے ہوں گے۔ کھاریاں سے آگے پہاڑیاں آتی ہیں۔ یہ پہاڑیاں "پوٹھوہار" کی پہاڑیاں کہلاتی ہیں۔ یہ کھاریاں سے راولپنڈی کے آگے تک اور چکوال سے کالاباغ اور دریائے سندھ تک پھیلی ہوئی ہیں۔ یہ بہُت زیادہ بلند نہیں ہیں۔ ان کی سب سے بلند چوٹی "سکیسر" ہے جو 5000 فٹ بلند ہے۔ اِنہی پہاڑیوں میں کھیوڑا کے مقام پر نمک کی کانیں، کلرکہار، باالکیر، اور سکیسر پُرفضا اور تفریحی مقامات ہیں۔

Sharjeel Ahmed

سیر کو سوا سیر

زیبُ النِّساء علیم

"چلو شبّو" گڈّو نے کہا۔

"نہیں۔ میں تمہارے ساتھ نہیں کھیلوں گی۔"

"کیوں؟"

"اِس لیے کہ تم مجھے مارتے ہو، اور کھیل میں بے اِیمانی بھی کرتے ہو۔"

"اچھا بابا، اب نہیں کروں گا" گڈّو نے کہا "اب تو چلو۔"

شبّو جانتی تھی کہ ایسا نہیں ہو گا، مگر پھر بھی مان گئی۔

گڈّو اور شبّو بہُت پیارے بچّے تھے۔ شبّو چوں کہ گڈّو سے بہُت چھوٹی تھی، اِس لیے گڈّو اُسے زیادہ ہی اپنے رُعب میں رکھتا تھا اور اُسے تنگ بھی بہُت کرتا تھا۔ کبھی اُس کی چھوٹی سی چُٹیا پکڑ کر کھینچتا اور وہ درد سے چِلّاتی تو کہتا "تم تو سدا کی ڈرپوک ہو۔ بہادُر بنو۔"

وہ روتی ہوئی امّی کے پاس چلی جاتی۔ پھر بعد میں گڈّو کو امّی سمجھاتیں۔ کبھی کبھی پٹائی بھی کرتیں۔ مگر اُس پر کچھ اثر نہ ہوتا۔ اُسے اپنی چھوٹی بہن کو ستانے میں زیادہ ہی مزا آتا تھا۔

اکثر اوقات یہ ہوتا تھا کہ شبّو باغ سے امرود چُن کر لاتی تو گڈّو چھین لیتا اور اُسے دِکھا دِکھا کر کھاتا۔ جواب میں شبّو اپنے چھوٹے چھوٹے دانت پیستی ہوئی پیچھے دوڑتی تو ہنستا ہوا بھاگ جاتا اور کہتا "تم بھاگتی ہو تو لگتا ہے کہ چھوٹا سافٹ بال لُڑھک رہا ہے۔" وہ ناراض ہو جاتی، لیکن جلد ہی دوستی بھی ہو جاتی۔

ایک دن اُن کی پُھوپھو ملنے آئیں۔ گوشی اور ببّو بھی اُن کے ساتھ تھے۔ جب پُھوپھو جانے لگیں تو دونوں بہن بھائیوں نے ضِد کر کے گوشی اور ببّو کو روک لیا۔ پھوپھو نے کہا کہ اِنہیں ایک ہفتے بعد بھیج دینا۔

گوشی اور ببّو کے رُکنے سے اُن کی تو عید ہو گئی۔ گڈّو اور ببّو گیند بلّے کے ساتھ اور گوشی اور شبّو گڑیا کے ساتھ کھیلتی رہتیں۔ اُس دن بھی وہ دونوں گڑیا کے ساتھ کھیل رہی تھیں کہ گڈّو چپکے سے آیا اور اُن کی گڑیا چھین لی۔

"بھیّا، میری گڑیا واپس کر دو" شبّو روہانسی ہو گئی۔

"اُوں ہُوں" گڈّو نے گڑیا کو ہوا میں اُچھالتے ہوئے ہنس کر کہا۔

"تمھیں تو پتا ہی ہے شبّو، میں اور ببّو ڈاکٹر بنیں گے۔ لہٰذا سب سے پہلے ہم گڑیا کا پوسٹ مارٹم کرتے ہیں۔ تم خوش تو ہو ناں؟ یہ کہ کر گڈّو نے جھٹکے سے گڑیا کا سر علیٰحدہ کر دیا۔

"ہائے اللہ!" شبّو نے زور زور سے رونا شروع کر دیا۔

امّی جان نے دوسرے کمرے سے آواز دی۔ گڈّو نو دو گیارہ ہو گیا۔

"پتا نہیں، اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہیں۔ جب دیکھو، میری گڑیا کے دشمن بنے رہتے ہیں۔" شبّو رو رہی تھی۔

"تم بھی اُن کی کوئی چیز خراب کر دو" گوشی نے اُس کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

گڈّو اور ببّو باہر جا چکے تھے۔ گوشی اور شبّو اُن کے کمرے میں گئیں۔ شوکیس پر بھالو رکھا تھا۔ برابر میں بڑی سی رنگین فٹ بال پڑی تھی، جو ابّو نے گڈّو کو پاس ہونے پر دی تھی۔

"میں اِن کی فٹ بال میں سوراخ کر دیتی ہوں" شبّو نے گوشی سے کہا اور فٹ بال میں سوراخ کر دیا۔ پھر دونوں اطمینان سے باہر آ گئیں۔

تھوڑی دیر کے بعد گُڈّو واپس آیا اور سیدھا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ پھر فوراً ہی پلٹ کر آیا اور شبّو اور گوشی کے پاس کھڑا ہو گیا۔ اُنھوں نے اُس کی طرف کوئی توجّہ نہ دی بلکہ یوں ہی اِدھر اُدھر ہاتھ مارنے لگیں، جیسے کوئی کام کر رہی ہوں۔

"تم نے میری فٹ بال میں سوراخ کر دیا؟" گُڈّو نے پوچھا۔

"کیا؟" شبّو نے مذاق اُڑانے والے انداز میں اُس کی طرف دیکھا۔

"تم نے میری فٹ بال میں سوراخ کیا ہے، کیوں؟" گڈّو نے چلّا کر کہا۔

"ہمیں کیا ضرورت پڑی ہے سوراخ کرنے کی" شبّو نے کہا۔

"اچھا، پھر کس نے کیا ہے؟" گڈو غصّہ ضبط کرتے ہوئے بولا۔

"ہمیں کیا معلوم" شبّو نے جواب دیا۔

"میں بتاتی ہوں۔ تمھارے کمرے میں جو بھالو ہے نا، وہ بڑا شریر ہے۔ اُسی نے کیا ہو گا۔"

"وہ کیسے کر سکتا ہے؟ وہ تو کھلونا ہے" گڈّو کو اب سچ مُچ غصّہ آ گیا۔

"وہ بھالو جادو کا ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہم تمھارے کمرے کے پاس سے گزرے تو...... " وہ خاموش ہو گئی۔

"تو......؟" گڈّو نے حیرت سے پوچھا۔

"تمھارے کمرے سے ہنسنے کی آوازیں آ رہی تھیں" گوشی نے آہستہ سے کہا "اور جب میں نے کمرے میں جھانک کر دیکھا تو کوئی نہیں تھا۔ البتّہ تمھارا بھالو ہِل رہا تھا، زور زور سے۔"

"ہیں!!" گڈّو کا مُنہ حیرت سے کُھل گیا۔

"زیادہ بننے کی کوشش نہ کرو" ببّو نے گوشی کو گھورا "خبردار! جو جھوٹ بولا۔"

"چھوڑو، گوشی" شبّو نے کہا "نہیں مانتے، نہ مانیں۔ ہمیں کیا۔ سونا تو اِنھیں اُسی کمرے میں ہے۔ رات کو پتا چل جائے گا۔"

یہ کہ کر گوشی اور شبّو لان میں چلی گئیں۔ پھر جو اُن کی ہنسی چھوٹی تو دیر تک ہنستی رہیں۔ "بڑے بہادر بنتے تھے۔ اب مزا آ جائے گا" گوشی نے شبّو سے کہا۔

رات دیر تک گڈّو اور ببّو امّی کے کمرے میں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ آخر امّی نے کہا "کیا تمھیں نیند نہیں آ رہی؟"

"نہیں، امّی جان"

"جا کر بستر پر لیٹ جاؤ۔ لیٹنے سے خود بہ خود نیند آ جائے گی"۔ دونوں بے دِلی سے اُٹھے اور اپنے کمرے میں چلے گئے۔

"ایسا کرتے ہیں، بھالو کو اندر الماری میں رکھ دیتے ہیں" گُڈّو نے چادر اوڑھتے ہوئے ببُّو سے کہا۔

"ہاں، ٹھیک ہے۔ الماری میں رکھ دو" ببّو لیٹتے ہوئے بولا۔

رات کے کسی پہر گڈّو کی آنکھ کُھلی۔ اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا تو شوکیس پر اُسے بھالو نظر آیا۔ اندھیرے میں اُس کی لال آنکھیں چمک رہی تھیں۔ "پتا نہیں بھالو الماری سے کیسے نکل

آیا؟" وہ سوچنے لگا۔ اُسے یاد ہی نہیں رہا تھا کہ اُس نے بھالو کو الماری میں رکھا ہی نہیں تھا۔ مارے ڈر کے اُس نے زور سے چیخ ماری۔ ببّو گھبرا کر اُٹھ بیٹھا۔ "کیا ہُوا؟" اُس نے پوچھا مگر گڈّو بے ہوش ہو چکا تھا۔

چند دن تک سب نے گڈّو کا خوب مذاق اُڑایا۔ "واہ وا! کتنے بہادر ہیں، ہمارے بھائی" شبّو اور گوشی جب بھی گڈّو کو دیکھتیں، اُسے چھیڑنے لگتیں۔ گڈّو بس کھسیانا ہو کر رہ جاتا۔

لیکن ایک دن گڈّو کو معلوم ہو گیا کہ یہ ساری شرارت شبّو اور گوشی کی تھی۔ وہ اپنے کمرے میں جا رہا تھا کہ اُس نے اُن کی باتیں سُن لیں۔ اُس وقت وہ یہی باتیں کر رہی تھیں۔

"ٹھیک ہے۔ سمجھ لوں گا۔ بدلہ نہ لیا تو میرا نام بھی گڈّو نہیں" اُس نے دانت پیستے ہوئے اپنے آپ سے کہا۔

"تم بھی تو اُنہیں تنگ کرتے ہو۔ اب اُنہوں نے شرارت کی تو اِس میں بُرا ماننے کی کیا بات ہے؟" ببّو نے اُسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

پھر اگلے ہی دن گڈّو نے شبّو کو ڈانٹتے ہوئے کہا "تمہیں شرم نہیں آتی بڑے بھائی کو تنگ کرتے ہوئے؟"

"آپ کو تو بڑی شرم آتی ہے چھوٹی بہن کو تنگ کرتے ہوئے" شبّو نے بھی اُسی طرح سخت لہجے میں جواب دیا۔

گڈّو زور سے ہنس پڑا۔ اُسے ببّو کی بات یاد آ گئی تھی۔ شبّو بھی ہنسنے لگی۔ اُس کی ہنسی میں گوشی اور ببّو بھی شریک ہو گئے۔ "اللہ کرے ہم ہمیشہ اِسی طرح ہنستے رہیں" ببّو نے گڈّو سے کہا اور دونوں باہر چلے گئے۔

شبّو گوشی کو لے کر چھت پر چلی گئی اور مٹّی کے برتنوں سے دُکان سجانے لگی۔ "اب بھیّا کو معلوم بھی نہیں ہو گا کہ ہم کہاں ہیں" شبّو نے گوشی سے کہا۔

"اور کیا۔ وہ تو تمہارے برتن اور کھلونے توڑ دیتے ہیں" گوشی نے جواب دیا۔

دونوں باتیں بھی کرتی جاتی تھیں اور ساتھ ساتھ برتن اور کھلونے بھی سجاتی جاتی تھیں۔ اُنہیں اِس بات کا علم نہیں تھا کہ گڈّو اُنہیں چھپ کر دیکھ رہا ہے اور ببّو نیچے کمرے میں کہانیوں کی کتاب پڑھنے میں مصروف ہے۔

"تم ذرا اِس برتن میں پانی بھرو۔ میں آٹا گوندھی ہوں۔" یہ کہہ کر شبّو نے تھوڑی سی مٹّی ایک برتن میں ڈالی اور اُسے گوندھنے لگی۔

گوشی پانی لینے چلی گئی۔ گڈّو چپکے سے، دبے پاؤں آیا اور دو کھلونے اُٹھا لیے۔ ابھی سیڑھیوں تک نہیں پہنچا تھا کہ شبّو کی اُس پر نظر پڑ گئی۔ وہ اُس کے پیچھے بھاگی "نہیں بھیّا، نہیں۔"

گڈّو تیزی سے سیڑھیاں اُترنے لگا کہ اُس کا پاؤں پھسلا اور وہ نیچے گرتا چلا گیا۔

اُسے فوراً ہسپتال لے جایا گیا۔ اُس کے سر، ٹانگوں اور بازوؤں پر چوٹ لگی تھی۔ تھوڑی دیر بے ہوش رہنے کے بعد وہ ہوش میں آ گیا اور امّی اُسے گھر لے آئیں۔

"تمہیں منع کیا تھا کہ بہنوں کو مت ستایا کرو۔ اب ملی نا اِس کی سزا" ابّو نے کہا۔

"ذرا دیکھو تو، کیسی چوٹ لگی ہے" امّی بولیں۔

"شبّو کی بد دُعا سے" گڈّو نے کراہتے ہوئے کہا۔

"یہ کیوں نہیں کہتے کہ اپنی حرکتوں کی وجہ سے" شبّو نے رونی آواز میں کہا۔

گڈّو نے دیکھا، شبّو کی آنکھوں میں آنسو جھل مل کر رہے ہیں۔

"میری بہن مجھ سے کتنی محبّت کرتی ہے" اُس نے سوچا "اور میں اِسے تنگ کرتا ہوں، مارتا ہوں، ڈانٹتا ہوں۔ اگر اِسے مجھ سے محبّت نہ ہوتی تو اِس وقت اِسے خوش ہونا چاہیئے تھا۔ مگر ــــــ"

اُس نے پیار بھری نظروں سے بہن کی طرف دیکھا۔ ببّو سمجھ گیا کہ اُسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے۔ اُس نے مسکرا کر کہا "گڈّو بھائی، کبھی سیر کو سوا سیر بھی ٹکرا جاتا ہے۔"

اِس پر سب ہنس پڑے۔

Sharjeel Ahmed

حکایاتِ بوستانِ سعدیؒ

ایک آدمی کی پنڈلی میں کُتّے نے کاٹ لیا۔ بے چارہ ساری رات درد سے کراہتا رہا۔ باپ کو تکلیف میں دیکھ کر چھوٹی لڑکی نے کہا "ابّا جان، کیا آپ کے دانت نہ تھے کہ آپ بھی کتّے کو کاٹ لیتے؟"

باپ نے جواب دیا "پیاری بیٹی، آدمی کُتّوں کو نہیں کاٹتے۔ ہاں، کتّا اپنی ذات کے مُوافق کام کرتا ہے"۔

سانپ ہے سب کو بے سبب ڈستا
آدمی سانپ کو ہے کب ڈستا؟

کسی نے سعدیؒ شیرازی سے پوچھا "اولاد کی تربیت کیسے کرنی چاہیے؟"

آپ نے جواب دیا:۔

(1) اولاد کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اُس کا اُخلاق اچھا ہو۔

(2) بچّہ جوں ہی بولنا شروع کرے، دھیان رکھو کہ گالی اور بُری بات مُنہ سے نہ نکلے۔

(3) دس برس کی عُمر ہو تو ہر ایرے غیرے کی صُحبت سے قطعی پرہیز کراؤ۔

(4) پڑھنے بیٹھے تو پہلے نرمی سے پڑھاؤ۔ جب کچھ چل نکلے تو سختی سے بھی نہ گھبراؤ۔

(5) ناز و نعمت اور لاڈ پیار عام طور سے بچّوں کو تباہ کر دیتے ہیں۔ اِس لیے جہاں تک ممکن ہو، سادہ عادتیں ڈالو۔

(6) بُزرگوں اور اُستادوں کا ادب کرنا سکھاؤ اور اُن کی گھُرکیوں پر رنجیدہ نہ ہونے دو۔

(7) بچّوں کی کھانے پینے کی ضرورتیں خود پوری کرو۔ روپیہ پیسہ اُن کے ہاتھ میں نہ دو، کیوں کہ اِس طرح اکثر بُرائیاں پیدا ہوتی ہیں۔

(8) دُنیا کی ہر دولت آنی جانی ہے۔ ہاں ایک عِلم کی دولت ہے جو ہمیشہ پاس رہتی ہے۔ اِس لیے اولاد کی خاطر مکان، روپیہ اور جائداد کا ترکہ نہ چھوڑو بلکہ عِلم و ہُنر کی دولت چھوڑو۔ عِلم والا کبھی محتاج نہیں رہتا اور بے ہُنر کو اگر خزانہ بھی مل جائے تو مُفلِس ہی رہتا ہے۔

سُلطان طُغرل ایک خدا ترس بادشاہ گزرے ہیں۔ ایک بار، سردی کے موسم میں، وہ رات کی گشت سے واپس آئے۔ محل میں جانے لگے تو ایک چوکیدار کو دیکھا کہ سردی کے مارے تھر تھر کانپ رہا ہے۔ سُلطان نے کہا "ذرا صبر کرو۔ ہم تمہیں ابھی گرم کوٹ بھیجتے ہیں۔"

لیکن محل میں جا کر کچھ ایسے کام آ لگے کہ وعدہ یاد نہ رہا۔ سلطان کاموں کو نپٹا کر بستر پر گئے اور پڑتے ہی سو گئے۔ اچانک خواب میں دیکھا کہ ایک شخص کہہ رہا ہے "خدا کی بخشی ہوئی نعمت کا یہی شکریہ ہے کہ بادشاہ چوکیدار کو کوٹ کے اِنتظار میں بے چین رکھے اور خود نرم و گرم بستر پر سو جائے۔؟"

سُلطان طُغرل یہ سُنتے ہی نیند سے چونک پڑے، چوکیدار کے پاس کوٹ لے کر خود پہنچے اور دیر ہو جانے کی مُعافی مانگی۔

دھوبن

ہمارے اِسکول میں پانچویں کلاس کے رِزلٹ کے موقع پر ایک ڈراما ہوا، جس میں مجھے دھوبن کا کِردار دیا گیا۔ جب نئی کلاسیں شروع ہوئیں تو مجھے میری کلاس کی لڑکیاں دھوبن کہہ کر چھیڑنے لگیں۔ میں برداشت کر گئی۔ لیکن جب یہ روزانہ کا معمول بن گیا تو تنگ آ کر میں نے مس شافیہ سے شکایت کی۔ مس شافیہ نے لڑکیوں کو ڈانٹا اور کہا۔ کہ آیندہ مدیحہ کو دھوبن مت کہنا۔

ایک دِن میں کلاس میں سبق سُنا رہی تھی کہ اِسکول کا چپراسی آ کر کہنے لگا "مس، آپ کی کلاس میں جو دھوبن پڑھتی ہے، اُسے مس عُظمیٰ بُلا رہی ہیں۔"

یہ سُن کر لڑکیاں تو ہنسیں سو ہنسیں، مس بھی ہنسی ضبط نہ کر سکیں۔

مدیحہ اِسماعیل، پیپلز کالونی گوجرانوالہ

(اِنعام یافتہ: 250 روپے کی کتابیں)

فقیر

ایک دن ہم سب گھر والے خوش گپّیوں میں مصروف تھے۔ شام کا وقت تھا۔ ہلکے ہلکے بادل چھائے ہوئے تھے۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ اچانک گیٹ کی گھنٹی بجی۔ میں نے اپنے چھوٹے بھائی عمار کو پتا کرنے کو کہا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ آیا اور کہا کہ فقیر آیا ہے۔ ابّو نے کہا "اُسے ایک روپیہ دے کر چلتا کرو۔"

میرا بھائی ابّو سے روپیہ لے کر باہر فقیر کو دے آیا اور واپس آ کر کہنے لگا "ابّو، وہ تو صاف کپڑوں والا فقیر ہے۔" یہ سُن کر میں جلدی سے اُٹھا اور باہر جا کر دیکھا تو بمشکل اپنی ہنسی ضبط کر سکا۔ دراصل وہ ابّو کے پُرانے دوست فقیر محمّد صاحِب تھے۔ میں نے اندر آ کر گھر والوں کو بتایا تو وہ ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو گئے۔ (محمّد عُمر چیمہ ملتان)

مُردے کھائے

میرا چھوٹا بھائی توتلا ہے اور ایسی باتیں کرتا ہے کہ ہم سب ہنس ہنس کر بے حال ہو جاتے ہیں۔

ایک دفعہ ہم اپنے چچا کے ہاں دعوت پر گئے۔ ابّو گھر پر ہی تھے۔ وہاں میرے بھائی کو سب سے زیادہ مُرغ کا سالن پسند آیا۔ جب ہم گھر واپس آئے تو ابّو نے اُس سے پُوچھا "بیٹا، تم نے وہاں کیا کھایا؟ بھائی بولا "میں نے وہاں مُردے کھائے۔" یہ سُن کر ہم سب ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو گئے۔ (شازیہ فتح، اِسلام آباد)

سگی بیوی بھی نہ کرتی

میری بڑی بہن جن کا نام قُرۃُ العین ہے، راولپنڈی میں رہتی ہیں، اور ہر سال عیدُالفِطر اور عیدُالاضحیٰ کے موقع پر

فیصل آباد ہم سے ملنے آتی ہیں۔ اِس مرتبہ بھی عیدُالاضحیٰ کے موقع پر اپنے پانچ عدد بچّوں سمیت ہمارے ہاں آئیں۔

ایک دن وہ امّی سے اِدھر اُدھر کی باتیں کر رہی تھیں۔ میں اور میرا بھانجا اویس، جس کی عُمر سات سال ہے، قریب ہی بیٹھے اُن کی باتیں سُن رہے تھے۔ باتوں باتوں میں امّی نے باجی کو اپنے کسی عزیز کا قِصّہ سُناتے ہوئے کہا کہ احمد کی ماں اُس کے بچپن میں ہی فوت ہو گئی تھی۔ اُس کے باپ نے دوسری شادی کر لی۔ احمد کی نئی ماں نے احمد کی اِتنی محبّت سے پرورِش کی کہ سگی ماں بھی نہ کرتی۔

میری باجی نے بتایا کہ راولپنڈی میں اُن کے پڑوس میں کوئی حامد صاحِب رہتے ہیں۔ جب اُن کی پہلی بیوی فوت ہو گئیں تو اُنھوں نے دوسری شادی کر لی۔ اُن کی دوسری بیوی نے اُن کی اِتنی خدمت کی کہ.....

یہاں تک کہ کر باجی کو کھانسی آ گئی۔ اویس نے باجی کا جُملہ مکمّل کرتے ہوئے کہا "اُن کی دوسری بیوی نے اُن کی اِتنی خدمت کی کہ کوئی سگی بیوی بھی کیا کرے گی۔" یہ سُن کر ہم ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو گئے۔

(صادِق علی، سرفراز کالونی فیصل آباد)

مُنھ کالا بے اِیمان کا

پچھلی گرمیوں کی بات ہے، ملتان سے ہماری خالہ اپنی بیٹی ناہید اور بیٹے جاوید کے ساتھ ہمارے گھر آئیں۔ ناہید بہت شریر ہے۔ ہر وقت شرارت کے موڈ میں رہتی ہے۔ ایک دن ہم لوگ تجارتی گیم کھیل رہے تھے۔ طے پایا کہ جو ہارے، اُس کا مُنھ کالا کیا جائے۔ آخر میں ناہید اور جاوید بھائی رہ گئے۔ ناہید نے دیکھا کہ وہ ہار رہی ہے تو اُس نے لُڈو اُلٹ دی اور بھاگ گئی۔ جاوید بھائی دونوں ہاتھ سیاہ کر کے اُس کے پیچھے دوڑے۔ ناہید ایک کمرے سے دوسرے میں اور دوسرے سے تیسرے میں بھاگتی رہی۔

شام کا وقت تھا اور بجلی چلی گئی تھی۔ ناہید بڑے کمرے میں گئی تو جاوید بھائی بھی جا پہنچے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ ناہید دوپٹا اوڑھے نماز پڑھنے میں مصروف ہے۔ جاوید بھائی بولے "ہُوں! یہ بغیر وضو کی نماز" یہ کہ کر بڑے مزے سے اُس کا مُنہ کالا کرتے جاتے اور کہتے جاتے "منھ کالا بے اِیمان کا"

جب خوب مُنھ کالا کر دیا تو فخر سے سینہ پُھلائے باہر نکلے۔ مگر یہ کیا.....؟ ناہید سامنے کھڑی ہنس رہی تھی۔ وہ ابھی حیران ہو ہی رہے تھے کہ اندر سے خالہ کی آواز آئی "اِدھر آ اِیمان دار کے بچّے۔ نالائق نے نہ جانے کیا مَل دیا میرے چہرے پر۔" (غزالہ شہناز، جوہر آباد)

بوتل آئی ہے

ہماری ایک آنٹی ہیں۔ وہ کراچی میں رہتی ہیں۔ اُن کا نام بتُول ہے۔ وہ ہمارے گھر بہت کم آتی ہیں۔ ایک دن میں کمرے میں بیٹھا پڑھ رہا تھا کہ میرا چھوٹا بھائی طلال، جس کی عُمر تین سال ہے آیا اور اٹک اٹک کر بولا "ب، ب، بوتل آئی ہے"

میں نے سوچا کہ شاید کولڈ ڈرنک کی بوتلیں آئی ہیں۔ لیکن جب بھاگتا ہُوا ڈرائنگ روم میں پہنچا تو وہاں آنٹی بتُول بیٹھی ہوئی تھیں۔ میں اِتنا ہنسا اِتنا ہنسا کہ پیٹ میں درد ہونے لگا۔

(عبُدالوہاب لیاقت، کالج روڈ راولپنڈی)

سلام علیکُم، خالہ جان!

یہ پچھلی گرمیوں کی بات ہے۔ ایک دِن میں اپنے دوست کے گھر گیا۔ وہاں صحن میں گُلابی رنگ کے پھول دار کپڑے پہنے کوئی بیٹھا سر دھو رہا تھا۔ اُس کے لمبے لمبے بال زمین کو چھُو رہے تھے۔ جِس سے میں نے اندازہ لگایا کہ یہ میرے دوست کی امّی جان ہیں۔

میں نے نہایت ادب سے کہا "سلام علیکُم، خالہ جان۔"

میرا دوست بھی قریب ہی کھڑا تھا۔ اُس نے بے ساختہ قہقہہ بلند کیا اور پھر بولا "یہ خالہ جان نہیں، ہمارے بڑے بھائی جان ہیں۔ اِن کا حُلیہ ہی ایسا ہے۔ اِس میں تمُہارا کوئی قصُور نہیں۔" (اِعجاز افضل، راولپنڈی)

آپ بھی لکھیے

اِحساس

رِضوان اکرم، جہلم کینٹ

ہم ہر روز بابا فضل دین کے باغ سے امرود توڑتے، پھول توڑتے اور پودوں کو خراب کرتے، اور جب بابا ڈنڈا لے کر آتا تو بھاگ کھڑے ہوتے۔

ایک بار ہم اِسی طرح امرود اور پھول توڑ رہے تھے کہ اچانک فضل بابا آگیا۔ ہم ڈر کر بھاگنے لگے تو اُس نے ہمیں پیار سے روک لیا۔ آج اُس کے ہاتھ میں ڈنڈا بھی نہیں تھا، حال آں کہ اُس نے کبھی اُسے اِستعمال نہیں کیا تھا مگر پھر بھی ہمیں ڈر لگتا تھا۔ ہم بہت حیران ہوئے کہ بابا ہمارے پیچھے دوڑا کیوں نہیں۔

خیر، ہم ڈرتے ڈرتے بیٹھ گئے تو وہ کہنے لگا "آج میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا۔ آرام سے میری بات سُنو۔ تم لوگوں کو پڑھنے کے عِلاوہ کچھ بنانا بھی آتا ہے؟"

ہم نے کہا "ہمیں اِسکول میں چھوٹی چھوٹی چیزیں بنانا سِکھائی جاتی ہیں۔"

وہ بولا "مجھے اپنی بیٹی کو تحفہ دینا ہے۔ تُم مجھے ایک چھوٹا سا گُڑیا کا گھر بنا دو گے؟"

ہم نے کہا "بابا، یہ تو کوئی مشکل بات نہیں بنا دیں گے۔"

ہم نے ایک ڈیڑھ فُٹ کا موٹا گتّا لیا اور گھر بنانا شروع کر دیا۔ ہم روز شام کو ایک گھنٹا اِس کام میں لگاتے۔ ہم نے اُس میں رنگ برنگے شیشے بھی لگائے، لکڑیوں پر پینٹ بھی کیا اور پھر اُس میں چھوٹے چھوٹے پودے بھی لگا دیے۔ آخر دس روز کی محنت کے بعد گھر تیّار ہو گیا۔ بابا بہت خوش ہوا۔ اُس نے کہا کہ کل پھر آنا۔ میں اِسے تمہارے سامنے اپنی بیٹی کو دوں گا۔

ہم اگلے روز خوش خوش آئے تو دیکھا کہ وہاں شیشے کے ٹُکڑے بِکھرے پڑے ہیں۔ ہم نے بابا سے پوچھا کہ گھر کہاں ہے تو وہ بولا "وہ تو میں نے توڑ دیا۔" یہ سُن کر ہمیں بہت افسوس ہوا۔ ہمیں اُداس دیکھ کر بابا نے کہا "بچّو! اب تمہیں اِحساس ہوا کہ کسی کا گھر خراب کرو تو اُسے کتنا دُکھ ہوتا ہے۔ تم میرا باغ خراب کرتے تھے تو مجھے بھی اِسی طرح افسوس ہوتا تھا۔" پھر ہنس کر بولا "یہ دیکھو، تمہارا گھر صحیح سلامت ہے۔ یہ تو شیشوں کے بچے کُھچے ٹکڑے تھے جو میں نے یہاں بکھیر دیے تھے۔"

ہم اپنا گھر، جو ہم نے بڑی محنت سے بنایا تھا، صحیح سلامت دیکھ کر بڑے خوش ہوئے۔ اُس دن سے ہم نے فضل بابا کا باغ خراب کرنے سے توبہ کر لی۔

(پہلا اِنعام: 50 روپے کی کتابیں)

بہت سی کہانیاں

آسیہ شریف، کوٹ مومن

ثمین اپنے والِدَین کی اِکلوتی بیٹی تھی۔ اُس کے امّی ابّو اُس پر جان فِدا کرتے تھے۔ ثمین کی عُمر جب پانچ برس کی ہوئی تو خدا نے اُسے ایک ننھی سی بہن دی۔ مگر بدقسمتی سے اُس کی پیدائش کے چند روز بعد اُس کی امّی اللہ میاں کے پاس چلی گئیں۔ ثمین کو بہت صدمہ پہنچا۔ وہ اپنی امّی کی موت کی ذِمّے دار اپنی معصوم بہن اُجالا کو سمجھتی تھی۔ اُس نے ہمیشہ اُس سے نفرت ہی کی۔

اب اُجالا کی عُمر 6 برس اور ثمین کی عمر 11 برس ہو چکی تھی۔ اُجالا روز ثمین سے کہتی کہ باجی، آؤ کھیلیں۔ مگر ثمین اُسے ڈانٹ دیتی۔ آج بھی اُجالا کھیلنے کے لیے ضِد کر رہی تھی۔ ثمین جو انگلش کا ہوم ورک کرنے میں مصروف تھی، چِلّا کر بولی "دفع ہو جاؤ یہاں سے۔ ہر وقت تنگ کرتی رہتی ہو۔ جاؤ۔ مجھے کام کرنے دو۔" اُجالا روتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔

ثمین شام کو ہوم ورک ختم کر کے کمرے میں گئی تو وہاں اُجالا بیٹھی تھی۔ ثمین کو دیکھ کر وہ اُٹھ بیٹھی اور بولی "باجی، مجھے بادشاہ کی کہانی سُناؤ۔ آج میں جب اِسکول گئی تو صدف کہہ رہی تھی کہ اُس کی امّی نے اُسے بادشاہ کی کہانی سُنائی تھی۔ باجی، مجھے بھی کہانی سُناؤ بادشاہ کی۔ صائمہ بھی کہہ رہی تھی کہ میری باجی مجھے بہت سی کہانیاں سُناتی ہیں۔" پھر مُنہ بنا کر بولی "آپ نے تو مجھے کبھی کوئی کہانی نہیں سُنائی۔"

ثمین تُنک کر بولی "مجھے نہیں آتی کہانی وانی۔ چلو، چُپ کر کے سو جاؤ، ورنہ ڈانٹ پڑے گی۔" دونوں بہنیں اپنے اپنے پلنگ پر خاموشی سے لیٹ گئیں۔

اُس رات، پچھلے پہر، ثمین کی آنکھ کُھلی تو اُسے کمرے میں کسی کے آہستہ آہستہ باتیں کرنے کی آواز آئی۔ اُس نے غور سے سُنا تو یہ اُجالا کی آواز تھی۔ وہ کہہ رہی تھی:

"امّی، پیاری امّی، آپ واپس آجائیں نا۔ مجھے کوئی کہانیاں نہیں سُناتا۔ باجی بھی نہیں اور ابّو بھی نہیں۔ صدف کی امّی اُسے کہانیاں سُناتی ہیں۔ آپ بھی مجھے کہانیاں سُنائیں گی نا؟ ابّو کہہ رہے تھے کہ آپ بہت دُور گئی ہیں۔ جب میں بڑی ہو جاؤں گی تو آپ واپس آجائیں گی۔ دیکھیں، امّی، میں اب بڑی ہو گئی ہوں۔ دوسری جماعت میں پڑھتی ہوں۔ آپ واپس آ جائیں۔ امّی، پلیز، واپس آجائیں۔ میں آپ کو کبھی تنگ نہیں کروں گی۔ بس آپ واپس آ جائیں۔"

ثمین کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ وہ اُٹھی اور اُجالا کو گلے سے لگالیا اور بِلک بِلک کر رونے لگی۔ جب اُس کا جی ہلکا ہُوا تو بولی "میری بہن، میری گڑیا، اب میں تمہیں بہت سی کہانیاں سُناؤں گی۔ میری پیاری بہن، بہت سی کہانیاں سُناؤں گی۔" (دُوسرا انعام:۔ 45 روپے کی کتابیں)

اِسے کیا کہیئے؟

خدیجہ، گُلشنِ اِقبال کراچی

"ہائے! ہائے! اِس ریل گاڑی کو بھی اِس ویران جگہ ہی کھڑا ہونا تھا؟" خالہ نے پنکھا جھلتے ہوئے کہا۔ "اگر کھڑا ہی ہونا تھا تو کسی ہرے بھرے مقام پر کھڑی ہوتی۔ کم از کم اچھے نظارے دیکھنے کو تو ملتے۔" خالہ کی بیٹی رِحرا نے چُونگ گم چباتے ہوئے کہا "بدتمیز ٹرین!" اِس پر خالہ نے اُسے آنکھیں دکھائیں اور میں اُس وقت کو کوسنے لگی جب میں نے خالہ کے ساتھ لاہور جانے کی ہامی بھری تھی۔ یہ میری دُور کی رشتے کی خالہ تھیں اور لوگ انہیں آفت کی پرکالا کہتے تھے۔ تیری میری بُرائی کرنا اور دوسرے کے کاموں میں عیب نکالنا، اُن کا محبوب مشغلہ تھا۔ لاہور جانے لگیں تو امّی سے اِصرار کر کے مجھے بھی ساتھ لے لیا۔ میں نے بھی سوچا کہ چلو، اِس بہانے لاہور کی سیر کر لوں گی۔

"اے بیٹا، ٹائم کیا ہو رہا ہے؟" خالہ نے پنکھا جھلتے ہوئے وقت پوچھا۔

"ارے خالہ، ابھی ایک مِنٹ پہلے تو آپ نے ٹائم پوچھا تھا۔ جو بتایا تھا، اُس میں ایک مِنٹ اور شامل کر لیں" میں نے جھنجلا کر جواب دیا۔

"اے دیکھو تو! کیسی بدتمیز لڑکی ہے۔ کیا یہی سب سیکھنے جاتی ہو اِسکول، ہر ماہ فیس دے کر؟" خالہ نے سامنے بیٹھی ہوئی ایک نفیس سی خاتون سے میری طرف اِشارہ کرتے ہوئے کہا۔ جواب میں وہ صرف مُسکرا کر رہ گئیں۔ لیکن اُن کا مُسکرانا غضب ہو گیا۔ خالہ کو موقع مل گیا اُن سے باتیں کرنے کا۔ کہاں سے آئی ہو؟ کہاں جانا ہے؟ اُنہوں نے بڑے دھیمے لہجے میں کہا "کینیڈا سے آئی ہوں اور اب کراچی سے لاہور جا رہی ہوں۔ وہاں میری رشتے کی بہن رہتی ہیں۔ اُنہوں نے بڑے اِصرار سے بُلایا ہے۔"

"ارے! آپ لاہور جا رہی ہیں؟ ہم بھی لاہور جا رہے ہیں" میں نے کہا۔

وہ بولیں "آپ کس کے پاس جا رہے ہیں؟"

اب خالہ شروع ہو گئیں "کیا بتاؤں، بیٹی۔ لاہور میں میری ایک دُور کی رِشتے دار رہتی ہے۔ اُس کی بیٹی کی شادی ہے۔

میرا دِل تو نہیں چاہ رہا تھا کہ جاؤں لیکن حِرا کے ابّو نے کہا کہ رشتے داروں کی خوشی میں شریک ہونا چاہیئے۔ ورنہ وہ عورت تو ایسی ہے کہ شیطان بھی پناہ مانگتا ہے اُس سے۔ اچھا خاصا ہمارا کاروبار چلتا تھا۔ ایسا جادُو کیا اُس عورت نے کہ ہم کنگال ہو گئے۔ ابھی تھوڑے دن ہوئے کہ ٹھیک ٹھاک ہوئے ہیں۔

جتنی دیر میں خالہ اپنی رشتے دار کی بُرائیاں کر کے فارغ ہوئیں، ریل چلنے لگی اور ہم سب نے اِطمینان کا سانس لیا۔ تھوڑی دیر بعد خالہ نے ٹائم پوچھا تو میں نے اِعلان کر دیا کہ کھانے کا وقت ہو گیا ہے۔ خالہ نے کہا اُوپر سے کولر اُٹھالو۔ میں ٹفن نکالتی ہوں۔ اب جو میں نے اُوپر سے کولر اُٹھایا تو ہاتھ ڈگمگایا اور وہ سیدھا خالہ کے سر پر گرا۔ اور خالہ اُوئی اوئے کرنے لگیں۔ اُنہیں سنبھلنے میں تھوڑا وقت لگا اور پھر کھانے کا دَور شروع ہو گیا۔ اُس نفیس سی خاتون نے بھی اپنا ناشتے دان کھول کر چکن بروسٹ نکالا۔ اُسے دیکھ کر حِرا ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگی۔ میں نے ٹوکا دیا تو اپنے کباب پراٹھوں پر ہاتھ صاف کرنے لگی۔ مگر تھوڑا سا کھانے کے بعد پھر اُس خاتون کو گھورنے لگی۔ خاتون نے جو ندیدوں کی طرح اُسے دیکھتے ہوئے دیکھا تو اُسے بھی ایک ٹکڑا اُٹھا کر دے دیا۔ تھوڑی دیر تک کھانے کا سِلسلہ چلتا رہا۔ کھانے کے بعد خاتون نے تھرماس میں سے چائے اُنڈیل کر کپ میں ڈالی تو خالہ نے کہا "ارے بیٹی، تمہیں کیسے پتا چلا کہ میں کھانے کے بعد چائے پیتی ہوں؟" پہلے تو خاتون نے حیرت سے اُنہیں دیکھا پھر جی، جی ہاں، مجھے پتا تھا کہ کر کپ اُنہیں دے دیا۔

اُس خاتون نے، چائے پیتے ہوئے، اپنی لاہور والی کزن کے بارے میں بتایا کہ بڑی بُردبار اور عُمدہ خاتون ہیں۔ جو ایک بار اُن سے مِل لے ہمیشہ کے لیے اُن کا ہو جاتا ہے۔

اِس پر خالہ تڑخ کر بولیں "ایک ہمارے رشتے دار ہیں، گنوڑ مارے۔ ایک دفعہ ملیں تو دوسری دفعہ شکل دیکھنے کو دل نہ چاہے۔" اِسی اثنا میں کسی مسافر نے ریڈیو لگا دیا اور خالہ گانا سُن کر جھومنے لگیں۔

آخر کار کچھ دیر بعد لاہور آ گیا۔ ہم سامان سمیٹ کر اور اُس خاتون کو خدا حافظ کہہ کر نیچے اُترے۔ خالہ نے اُترتے ہی اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں کہ کوئی اُنہیں لینے آیا ہے یا نہیں۔ اِتنے میں وہ خاتون بھی نیچے اُتر آئی تھیں اور ایک عورت سے، جو بہت عُمدہ کپڑے پہنے تھی، کہہ رہی تھی کہ آپ ڈرائیور بھیج دیتیں۔ خود کیوں زحمت کی آپ نے؟

اُس عورت نے کہا "تکلیف کیسی؟ تمہارے عِلاوہ میری ایک اور رشتے دار آنے والی تھیں۔ وہ بھی اِسی گاڑی میں ہوں گی۔" یہ کہہ کر اُس کی نظر خالہ پر پڑی تو وہ اُن سے لپٹ گئی اور کہنے لگی "بہت بہت شکریہ۔ آپ نے میری عِزّت بڑھا دی" پھر کہنے لگی "آؤ، میری کزن بھی آئی ہے، شادی میں شرکت کے لیے اِس سے ملواؤں تمہیں۔" اور جب وہ اُس نفیس خاتون سے خالہ کا تعارُف کرانے لگیں تو خالہ کا بُرا حال ہو گیا اُن کا دل چاہ رہا تھا کہ زمین پھٹ جائے اور وہ اُس میں سما جائیں۔ (تیسرا اِنعام: 40 روپے کی کتابیں)

جانتے ہو وہ کون تھا؟

قابِل خان، کوہاٹ

تُرکستان کے ایک شہر کا نام فاراب ہے۔ مُدّت گزری، اِس شہر کے کسی محلّے میں ایک غریب لڑکا رہتا تھا، جسے عِلم حاصِل کرنے کا از حد شوق تھا۔ دن کو تو وہ اپنے اُستاد کے ہاں جا کر سبق پڑھتا تھا اور جب رات آتی تو دن کا پڑھا ہوا سبق یاد کرتا تھا اور اُس وقت تک نہیں سوتا تھا جب تک سبق پوری طرح یاد نہیں ہو جاتا تھا۔ اُس کی چارپائی کے سرہانے مٹّی کا ایک دِیا جلتا رہتا تھا، اور اِسی دیے کی روشنی میں وہ رات گئے تک پڑھتا رہتا تھا۔

ایک رات کا ذِکر ہے، وہ چارپائی پر بیٹھا پُوری توجّہ سے کتاب کا مُطالعہ کر رہا تھا کہ دِیے کی روشنی مدّھم ہونے لگی۔ اُس نے بتّی کو اُونچا کیا۔ روشنی ہوئی تو ضرور مگر بہت جلد ختم ہو

گئی۔ اب جو اُس نے دِیے پر نظر ڈالی تو یہ دیکھ کر اُسے بڑا افسوس ہوا کہ دِیے میں تیل تو ہے ہی نہیں۔ روشنی ہو تو کیونکر ہو؟ اب میں کیا کروں؟ اُس نے سوچا۔

رات آدھی کے قریب گزر چکی تھی۔ دُکانیں بند ہو چکی تھیں، اور اگر دُکانیں کُھلی بھی ہوتیں تو اُسے کچھ فائدہ نہ ہوتا، کیوں کہ اُس کے پاس تیل خریدنے کے لیے پیسے نہ تھے۔ پیسوں کے بغیر کون دُکاندار اُسے تیل دے سکتا تھا؟ اِس حالت میں بہتر یہی تھا کہ کتاب ایک طرف رکھ کر سو جائے۔ مگر ابھی تو اُسے دو گھنٹے اور پڑھنا تھا۔ وہ یہ دو گھنٹے کس طرح ضائع کر سکتا تھا۔ اور پھر دوسرے دن بھی اُس کے پاس کہاں سے پیسے آ سکتے تھے۔ روٹی تو وہ ایک مسجد میں جا کر کھا لیتا تھا اور محلّے کے ایک بچّے کو پڑھا کر جو رقم ملتی تھی اُس سے وہ اپنے لیے معمولی کپڑا اور تیل وغیرہ خرید لیتا تھا۔

دِیے کے بُجھ جانے سے اُسے بڑا افسوس ہوا۔ وہ کوٹھڑی سے نکل کر دروازے پر آ بیٹھا۔ ہر طرف اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ کہیں بھی کوئی چراغ جلتا ہوا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ سب لوگ آرام سے سو رہے تھے۔

اِتنے میں اُس کی نظر ایک روشنی پر پڑی جو دُور کسی دیوار پر دکھائی دے رہی تھی۔ وہ اُٹھ بیٹھا اور یہ معلوم کرنے کے لیے کہ یہ روشنی کہاں سے آ رہی ہے، اُدھر قدم اُٹھانے لگا جدھر سے روشنی آ رہی تھی۔ کتاب بھی اُس کے ہاتھ میں تھی کہ موقع ملے تو اُس روشنی میں اُس کا باقی حصّہ پڑھ لے۔ کچھ دور جا کر اُس نے دیکھا کہ وہ روشنی ایک قندیل میں سے نکل رہی تھی اور یہ قندیل محلّے کے چوکیدار کے ہاتھ میں تھی۔ اُس نے چوکیدار سے بڑے ادب سے کہا کہ جناب، اگر آپ اِجازت دیں تو میں قندیل کی روشنی میں کتاب پڑھ لوں۔ چوکیدار نیک آدمی تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ یہ کوئی غریب طالبِ علم ہے۔ اِس کے پاس تیل خریدنے کے لیے پیسے نہیں ہیں۔ وہ بولا، ہاں پڑھ لو۔ میں تھوڑی دیر یہاں بیٹھ جاتا ہوں۔ لڑکا بیٹھ کر کتاب پڑھنے لگا۔

اب مشکل یہ تھی کہ چوکیدار ایک ہی جگہ زیادہ دیر تک ٹھہر نہیں سکتا تھا۔ وہ کہنے لگا "لو بیٹا، اب تم گھر جا کر سو جاؤ۔ مجھے آگے جانا ہے۔" لڑکا بولا "آپ ضرور جائیں۔ جہاں جی چاہے، جائیں۔ میں آپ کے پیچھے پیچھے چلوں گا۔" چوکیدار قندیل اُٹھا کر آگے آگے چلنے لگا اور لڑکا پیچھے پیچھے۔ اِس طرح کتاب پڑھنے میں اُسے دِقّت پیش آ رہی تھی لیکن اُس نے ہِمّت نہ ہاری۔ چار بجے تک پڑھتا رہا اور پھر چوکیدار کا شکریہ ادا کر کے گھر چلا گیا۔

دوسری رات بھی یہی واقِعہ ہُوا۔ تیسری رات لڑکا آیا تو چوکیدار کہنے لگا کہ لو، یہ قندیل اپنے گھر لے جاؤ۔ میں نئی قندیل لے آیا ہوں۔ لڑکے نے یہ سُنا تو اُسے اِتنی خوشی ہوئی جیسے بہت بڑا خزانہ مِل گیا ہو۔ وہ قندیل اپنی کوٹھری میں لے گیا۔ چند روز کے بعد اُسے پیسے ملے تو وہ بازار سے تیل خرید لایا۔ اِسی طرح دن گزرتے گئے۔ لڑکا جوان ہو گیا۔ جیسے جیسے اُس کی عُمر بڑھ رہی تھی، اُس کا عِلم بھی بڑھ رہا تھا۔

اور پھر ایک دن ایسا ہوا کہ وہ اپنے وقت کا سب سے بڑا اُستاد بن گیا۔ عِلم کے پیاسے لوگ دُور دُور سے آ کر اُس سے عِلم حاصل کرتے تھے۔ وہ عِلم کا ایک دریا بن گیا تھا۔ جانتے ہو وہ کون تھا؟ وہ تھا ابُو نصر فارابی، جس کی وفات کو تقریباً ہزار برس گزر چکے ہیں۔ اُس کے اپنے دِیے کی روشنی ختم ہو گئی، لیکن عِلم کا جو دِیا اُس نے جلایا تھا، اُس کی روشنی کبھی ختم نہ ہو گی۔

(چوتھا اِنعام:۔ 35 روپے کی کتابیں)

تین سوال

سعادت الطاف، راولپنڈی

"لو، وہ پھر آ گیا" بازار میں سے گزرتے ہوئے ایک راہ گیر نے دوسرے راہ گیر سے کہا اور وہ جس کے بارے میں کہہ رہا تھا، وہ شخص چوراہے پر آ کھڑا ہُوا اور ایک اُونچے سے ٹیلے پر چڑھ کر کہنے لگا:

"ہے کوئی ایسا مسلمان جو میرے تین سوالوں کے جواب دے؟"

اُس نے یہ جُملہ تین مرتبہ کہا مگر کوئی آگے نہ بڑھا۔ پھر اُس نے ایک قہقہہ لگایا اور ٹیلے سے اُتر کر واپس چلا گیا۔

"آخر کب تک یہ تماشا ہوتا رہے گا؟" ایک دُکان دار نے دوسرے دُکان دار سے کہا۔

"کیا کریں، بھائی۔ وہ غیر مُسلم ہو کر مُسلمانوں کو للکار رہا ہے، مگر ہم مسلمان اُس کے سوالوں کا جواب نہیں دے سکتے" دوسرے دکان دار نے جواب دیا۔

کوئی ایک مہینا پہلے یہ شخص وہاں آیا تھا۔ بہت پڑھا لکھا تھا، مگر تھا کافر۔ وہ ہر روز یہی سوال دُہراتا، مگر کوئی اُن کا جواب نہ دے پاتا۔

ایک دن وہ ٹیلے پر چڑھ کر وہی سوال دوہرا رہا تھا کہ ایک چھوٹے سے بچّے سے یہ برداشت نہ ہو سکا۔ اُس نے اللہ کا نام لیا اور آگے بڑھ کر بولا "میں تمہارے سوالوں کا جواب دوں گا۔" بازار میں موجود تمام لوگ اُس بچّے کی طرف مُتوجّہ ہو گئے۔

"تم؟ تم میرے سوالوں کا جواب دو گے؟ ہاہاہا! ہاہا ہا!" کافر زور زور سے ہنسنے لگا۔

"ہاں، اِنشاء اللہ میں تمہارے سوالوں کا جواب دوں گا" وہ بچّہ اپنے اِرادے پر اٹل تھا۔

"اچھّا تو، میرا پہلا سوال سُنو۔ یہ بتاؤ، اِس وقت تمہارا خدا کیا کر رہا ہے؟" کافر نے اُس سے پوچھا۔

پُورا مجمع خاموش تھا۔ ایسے میں وہ لڑکا بولا "پہلے آپ اپنی جگہ سے نیچے آئیں۔ تب ہی میں آپ کے سوال کا جواب دوں گا۔"

وہ شخص نیچے اُتر آیا۔ لڑکا ٹیلے کے اُوپر چڑھ گیا اور بولا "اے لوگو! گواہ رہنا۔ خدا اِس وقت ایک کافر کے مرتبے کو گھٹا رہا ہے اور ایک مُسلمان کے رُتبے کو بڑھا رہا ہے۔"

پورا مجمع بچّے کا یہ جواب سُن کر جھوم اُٹھا۔ کافر کچھ شرمندہ ہوا۔

"بتاؤ، تمہارا دوسرا سوال کیا ہے؟" بچّے نے پوچھا۔

"یہ بتاؤ، خدا سے پہلے کیا تھا؟" کافر نے سوال کیا۔

"پہلے تم دس سے اُلٹی گنتی شروع کرو" بچّے نے کہا۔

اُس نے اُلٹی گنتی شروع کی "دس، نو، آٹھ، سات، چھ، پانچ، چار، تین، دو، ایک" اور پھر چُپ ہو گیا۔

"بولو، رُک کیوں گئے؟ گِنو گِنتی" بچّے نے کہا۔

"مگر ایک سے پہلے تو کچھ نہیں ہے" کافر بولا۔

"لوگو! گواہ رہنا۔ اللہ بھی ایک ہے اور ایک اللہ سے پہلے کیا ہو سکتا ہے؟" بچّے کا یہ جواب سُن کر کافر ہکّا بکّا رہ گیا۔ اُسے پسینے آنے لگے۔

"تیسرا سوال" اِس دفعہ مجمع چلّایا، اور کافر نے پوچھا "یہ بتاؤ، خدا کا مُنہ کس طرف ہے؟"

لڑکے نے کچھ دیر سوچا اور پھر کہا "ایک موم بتّی لاؤ۔"

فوراً موم بتّی لائی گئی اور اُس کو روشن کیا گیا۔ پھر بچّے نے کافر سے پوچھا "یہ بتاؤ، اِس موم بتّی کا مُنہ کس طرف ہے؟"

"چاروں طرف" کافر بولا۔

"لوگو! گواہ رہنا۔ اللہ ایک نُور ہے یعنی روشنی اور وہ بھی چاروں طرف موجود ہے، اور سب کچھ دیکھ رہا ہے۔"

تیسرے سوال کا جواب سُن کر تو کافر کا مُنہ بالکل بند ہو گیا۔ اُس کو شکست ہو گئی اور اللہ نے یہ کام ایک بچّے سے لیا۔

یہ بچّہ بڑا ہو کر وقت کا سب سے بڑا اِمام بنا، اور یہ اِمام تھے حضرت ابُو حنیفہ"۔ اللہ تعالیٰ نے اُنہیں بچپن ہی سے کُفر کے خلاف جنگ کرنے کی صلاحیّت عطا فرمائی تھی۔

(پانچواں اِنعام:۔ 30 روپے کی کتابیں)

سعادت الطاف اپنا پورا پتا لکھیں

ہم فخرِ پاکستان ہیں

ناصر زیدی

اِقبال کا ہیں خواب ہم
قائِد کی ہم تعبیر ہیں
غازی ہیں ہم کِردار کے
گُفتار کی شمشیر ہیں
جُرأت پہ سب حیران ہیں
ہم فخرِ پاکستان ہیں

ہم پر وطن کو ناز ہے
ہم ہی ہیں اِس کے ترجُماں
مِعمار ہیں ہم قوم کے
ہم ہیں وطن کے پاسباں
ہر دَور کی پہچان ہیں
ہم فخرِ پاکستان ہیں

راشِدؔ کے اور بھٹیؔ کے بھی
ہم جانشیں ہیں جانشیں
ہم سے تو بڑھ کر دیس کا
کوئی مُحافِظ ہی نہیں
ایسے جَری اِنسان ہیں
ہم فخرِ پاکستان ہیں

(1) راشد منہاس شہید (2) عزیز بھٹی شہید

Sharjeel Ahmed

ذرا سی نیکی

سید نظر زیدی

ہمارے وطن پاکستان میں کوہ مری بہت خوب صورت تفریحی مقام ہے۔ لوگ یہاں تفریح اور گرمی کا موسم گزارنے آتے ہیں۔ اِس کے آس پاس گلیات ہیں۔ گھوڑا گلی، نتھیا گلی وغیرہ۔ گرمی کے موسم میں کچھ سیاح اِن گلیات میں بھی رہتے ہیں اور اُنہیں وہاں ہر طرح کا آرام ملتا ہے۔ پسینے میں بھگو دینے والی گرمی اور لُو کا یہاں نام نشان نہیں ہوتا۔

ایک دفعہ لاہور کا رہنے والا ایک ادیب گھوڑا گلی کے ایک معمولی سے ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا۔ وہ اپنی ایک کتاب مکمل کرنے کے لیے وہاں گیا تھا، لیکن پہنچا اُس زمانے میں تھا جب گرمی کا موسم گزارنے کے لیے آنے والے لوگ اپنے گھروں کو لوٹ رہے تھے۔ اِس ادیب کو ایسے وقت آنے کا یہ فائدہ ہوا تھا کہ ایک معمولی سے ہوٹل میں بالکل کم کرائے پر کمرا مل گیا تھا جس میں وہ بہت آرام سے رہ رہا تھا۔

ادیب کو یہ جگہ بہت پسند آئی تھی۔ وہ صبح شام سیر کے لیے نکل جاتا اور فرصت کے وقت لکھنے پڑھنے کا کام کرتا رہتا۔ اِس ہوٹل میں ٹھہرنے والے لوگ اپنے گھروں کو جا چکے تھے اِس لیے شور و غل بالکل نہ تھا۔ ایسا سکون ہو تو لکھنے پڑھنے کا کام خوب ہوتا ہے۔ چناں چہ یہ ادیب بھی نہایت اِطمینان سے اپنا کام کر رہا تھا۔

ایک دن کا ذکر ہے، وہ شام کی سیر کے لیے نکلا تو آسمان پر ہلکے ہلکے بادل نظر آ رہے تھے۔ پہاڑی مقامات پر ایسا عام طور پر ہوتا ہے۔ ادیب کے دل میں خیال تو آیا کہ کہیں بارش نہ آ جائے، لیکن بادل اِتنے ہلکے تھے کہ اُس نے اِس خیال کو دل سے دور کر دیا اور یہ سوچ کر سیر کے لیے روانہ ہو گیا کہ بارش کا خطرہ نہیں ہے۔ خیر خیریت سے ہوٹل لوٹ آؤں گا۔

یہ ادیب ہوٹل کے سامنے والی پہاڑی پر سیر کے لیے جایا کرتا تھا۔ ہوٹل کے سامنے سے ڈھلان شروع ہو جاتی تھی جس کے درمیان صاف سُتھری پگ ڈنڈی تھی۔ پہاڑی کے قریب پہنچ کر چڑھائی آتی تھی۔ ادیب یہ چڑھائی اور اُترائی اِطمینان سے طے کر لیتا تھا اور کچھ دیر پہاڑی کی سیر کر کے اپنے ہوٹل آ جاتا تھا۔ اُس دن بھی وہ مزے مزے سے چلتا ہوا پہاڑی پر پہنچ گیا، لیکن سیر کرنے کے بعد جب لوٹنے کا اِرادہ کیا تو دیکھتے ہی دیکھتے بادل گہرے ہو گئے، خوب تیز بارش برسنے لگی اور تھوڑی ہی دیر میں وہ پگ ڈنڈی پانی میں ڈوب

گئی جس پر چل کر وہ ہوٹل سے پہاڑی پر آتا اور واپس جاتا تھا۔

اب تو وہ بہت گھبرایا۔ اِس پگڈنڈی کے دونوں طرف بہت گہرے کھڈ تھے اور یہ خطرہ تھا کہ اٹکل سے چلا تو ضرور کسی گڑھے میں گر جائے گا۔ وہ رُک گیا اور بے بسی سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا کہ شاید کوئی ایسا آدمی مل جائے جو اُسے ہوٹل تک پہنچا دے۔ لیکن وہاں آدم تو کیا دُور دُور تک کوئی جانور بھی نظر نہ آتا تھا۔ بس ہوٹل کی عمارت دکھائی دے رہی تھی جس کے کمروں کی بتیاں جلا دی گئی تھیں اور یہ اِس بات کی نشانی تھی کہ سورج ڈوبنے والا ہے۔ وہ سوچنے لگا کہ اگر میں یہاں رُکا تو سردی سے مر جاؤں گا اور ہوٹل جانے کی کوشش کی تو کسی گڑھے میں گر کر ہلاک ہو جاؤں گا۔ کسی کو معلوم بھی نہ ہو گا کہ میرا کیا انجام ہوا۔ وہ اِس قدر گھبرایا اور ایسا ڈرا کہ زور زور سے چیخنے لگا "اگر کوئی یہاں ہے، تو خدا کے لیے میری مدد کرے۔"

اِتنے میں بارش اور تیز ہو گئی اور اندھیرا بڑھنے لگا۔ کپڑے بھیگ جانے کی وجہ سے اُسے سردی بھی لگنے لگی۔ اُس نے اور بھی زور سے مدد کے لیے پکارنا شروع کر دیا۔ یقین ہو گیا تھا کہ میں زندہ نہ بچوں گا۔ موت کا سایہ اپنی طرف بڑھتا ہوا محسوس ہو رہا تھا، لیکن اِسی حالت میں ایک بہت ہی عجیب اور بہت ہی نرالی بات ہوئی۔ اُسے یوں لگا کہ کوئی اُس کی شلوار کا پائنچہ پکڑ کر کھینچ رہا ہے۔ جُھک کر دیکھا تو مریل سا وہ کُتا نظر آیا جو ہوٹل کے سامنے بیٹھا رہتا تھا۔ کُتے کی اور اُس کی نظریں ملیں تو کُتے نے شلوار کا پائنچہ چھوڑ دیا اور دُم ہلاتا ہوا ایک طرف چلنے لگا۔ ادیب سمجھ گیا وہ اُسے اپنے پیچھے آنے کو کہہ رہا ہے۔ وہ کچھ سوچے بغیر کُتے کے پیچھے چلنے لگا۔

کُتا پانی میں کچھ دیر چلتا اور پھر پیچھے مُڑ کر یہ اِطمینان کر لیتا کہ ادیب اُس کے ساتھ آ رہا ہے یا نہیں۔ اِسی طرح وہ ہوٹل تک پہنچ گیا۔ وہ بُری طرح بھیگ گیا تھا۔ سردی سے دانت بج رہے تھے۔ لیکن اُس کی جان بچ گئی تھی۔ اُس نے پیار سے کُتے کی کمر پر ہاتھ پھیرا اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔

کپڑے بدلنے اور گرم گرم چائے پینے کے بعد ہوش و حواس ٹھیک ہوئے تو وہ اُس کُتے کے بارے میں سوچنے لگا جس نے اُس کی جان بچائی تھی۔ اُسے یاد آیا کہ آج میری وہ ذرا سی نیکی کام آ گئی جو میں اِس کُتے کے ساتھ کیا کرتا تھا۔ بات یہ تھی کہ جب یہ ادیب کھانا کھانے بیٹھتا تو تھوڑی سی روٹی اُس کُتے کے سامنے بھی ڈال دیتا۔ وہ سوچنے لگا کہ جب میری ذرا سی نیکی کا ایسا اچھا بدلہ ملا ہے تو اُن لوگوں کو کتنا بڑا انعام ملے گا جو بڑی بڑی نیکیاں کرتے ہیں۔

آپ نے جانوروں کی وفاداری کی بہت سی کہانیاں پڑھی ہوں گی۔ یہ کہانی ہمارے زمانے کی ہے اور بالکل سچی ہے۔ اِس میں جس ادیب کا ذِکر آیا وہ ہمارے مُلک کے بُزرگ اور بہت مشہور ادیب مولانا محمد عبداللہ قُریشی ہیں۔ مولانا نے یہ واقعہ ہمیں خود سُنایا تھا جسے ہم نے کہانی کے رنگ میں لکھ دیا۔

یہ حقیقت ہے

ہمارا سُورج

ہمارا سُورج ایک ستارہ ہے، اور اِتنا بڑا ہے کہ کھوکھلا ہوتا تو اِس کے اندر ہماری زمین جتنی 10 لاکھ زمینیں سما جاتیں۔ لیکن کائنات میں صِرف سورج ہی اِتنا بڑا ستارہ نہیں ہے۔ اِس جیسے بلکہ اِس سے بھی ہزاروں گُنا بڑے ستارے موجود ہیں۔

کیڑے خور پودے

اکثر کیڑے مکوڑے پودوں کے پتّے وغیرہ کھاتے ہیں۔ لیکن شاید آپ کو حیرت ہو کہ بعض پودے ایسے ہیں جو اِن کیڑے مکوڑوں کو کھا جاتے ہیں۔

ایک خاص قسم کا پودا جسے صُراحی پودا (Pitcher Plant) کہتے ہیں، کیڑے خور پودا ہے۔ اِس کے پتّے صُراحی یا گڑوی کی طرح ہوتے ہیں۔ بارش ہوتی ہے تو اِن پتّوں میں پانی بھر جاتا ہے۔ جب کیڑے، خوراک کی تلاش میں، اِن پتّوں پر آتے ہیں تو پھسل کر اندر گر جاتے ہیں اور پانی میں ڈوب کر مر جاتے ہیں۔ صُراحی پودا اُنہیں کھا جاتا ہے۔

کیڑے ہمارے دُشمن، ہمارے دوست

تمام کیڑے مکوڑے ہمارے دُشمن نہیں ہیں۔ شہد کی مکھی ہی کو لیں۔ یہ بھی ایک کیڑا ہی ہے، لیکن یہ ہماری دوست ہے کیوں کہ ہمیں شہد جیسی لذیذ اور مُفید چیز دیتی ہے۔ اِس کے عِلاوہ نَر درخت کا زرِگُل مادہ درخت کو اور مادہ درخت کا زرِگُل نر درخت کو پہنچاتی ہے جس سے اُن میں بیج آتے اور پھل لگتے ہیں۔

بعض کیڑے مکوڑے گندی چیزیں کھا کر فضا کو صاف رکھتے ہیں، اور بعض اُن کیڑوں کو کھاتے ہیں جو ہمارے دُشمن ہیں۔

29 نومبر 1969 کو انگلینڈ کے ایک باورچی، لیونارڈ اینڈریو، نے صِرف آدھ گھنٹے میں 77 آملیٹ بنائے۔ اُس کا یہ ریکارڈ آج تک کوئی نہیں توڑ سکا۔

آسٹریا کے ایک نوجوان، جوہان، نے اپنے دوستوں کے ساتھ ایک عجیب و غریب شرط لگائی۔ یہ شرط تھی آسٹریا کے دارُالحکومت ویانا سے فرانس کے دارُالحکومت پیرس تک ہاتھوں کے بَل جانا۔ ہِمّت کا دھنی جوہان، سڑک کے کنارے کنارے، ہاتھوں کے بَل چلتا رہا، چلتا رہا اور آخر کار دو مہینے بعد پیرس پہنچ گیا۔

1961 میں ایک امریکی آرٹسٹ، ہنری سے ٹس، نے کشتی کی ایک تصویر بنائی اور اُسے، نُمائش کے لیے، نیویارک کی آرٹ گیلری میں لٹکا دیا۔ ہزاروں لوگوں نے اِس تصویر کو دیکھا اور آرٹسٹ کے فن کی دل کھول کر تعریف کی۔ سات ہفتے بعد پتا چلا کہ تصویر اُلٹی لٹکی ہوئی ہے!

گھوڑے کی عُمر زیادہ سے زیادہ 30,25 سال ہوتی ہے۔ لیکن آسٹریلیا کا ایک گھوڑا 52 سال کا ہو کر مرا۔ دنیا کا سب سے اُونچا گھوڑا بھی آسٹریلیا ہی کا تھا۔ یہ سات فُٹ اُونچا تھا، اور اُس کا مالک اُس پر سیڑھی کے ذریعے سوار ہوتا تھا۔

سائنس کے کھیل

کھولتے ہوئے پانی کا چکّر

سامان :۔ بڑی بوتل، چُولھا، لکڑی کا بُرادہ

ایک بڑی سی بوتل لے کر اُس میں پانی بھر لیں۔ پھر تھوڑا سا لکڑی کا بُرادہ ڈال کر اچھّی طرح ہلائیں تاکہ بُرادہ پانی کے اندر بھی چلا جائے۔ اب بتایئے، کیا آپ بُرادے کو چھُوئے بغیر اُسے بوتل کے اندر گھما سکتے ہیں؟ آپ کہیں گے یہ ناممکن ہے۔ ہم کہتے ہیں، ناممکن نہیں۔ آیئے دکھائیں۔

بوتل کو چُولھے پر رکھ دیں۔ جب بوتل کا نچلا حصّہ گرم ہو گا تو اُس کا پانی بھی گرم ہو جائے گا اور وہ اُوپر کے حصّے کے ٹھنڈے پانی کی نسبت کم کثیف ہو گا۔ چُنانچہ زیادہ کثیف پانی نیچے آ جائے گا اور کم کثیف پانی اُوپر چلا جائے گا۔ اگر بوتل آگ پر رکھی رہے گی تو اُس میں پانی کا ایک باقاعدہ چکّر شروع ہو جائے گا۔ جو پانی نیچے ہو گا وہ گرم ہو کر اُوپر جائے گا اور جو پانی اُوپر کے حصّے میں ہو گا وہ نسبتاً کم گرم ہو گا اِس لیے وہ نیچے آ جائے گا۔ اِس لیے آپ برادے کو چھوئے بغیر گھمانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

اِس اُصول کے تحت سردیوں کے موسم میں عمارتوں کو سنٹرل ہیٹنگ سسٹم کے ذریعے گرم کیا جاتا ہے۔ پانی کو ایک بُوائلر میں گرم کیا جاتا ہے جو عمارت کے نچلے حصّے میں ہوتا ہے۔ گرم پانی اُوپر کے کمروں میں فِٹ کیے ہُوئے ریڈی ایٹروں میں چلا جاتا ہے اور وہاں ٹھنڈا ہونے کے بعد پھر بوائلر میں آ جاتا ہے۔ اِس طرح گرم پانی بغیر کسی پمپ کی مدد کے کمروں میں پہنچ کر اُن کو گرم کر دیتا ہے اور اُن کمروں میں رہنے والے سردی سے محفوظ رہتے ہیں۔ تصویر میں نچلی منزل میں بُوائلر اور اُوپر کی منزل میں ریڈی ایٹر دکھائے گئے ہیں۔

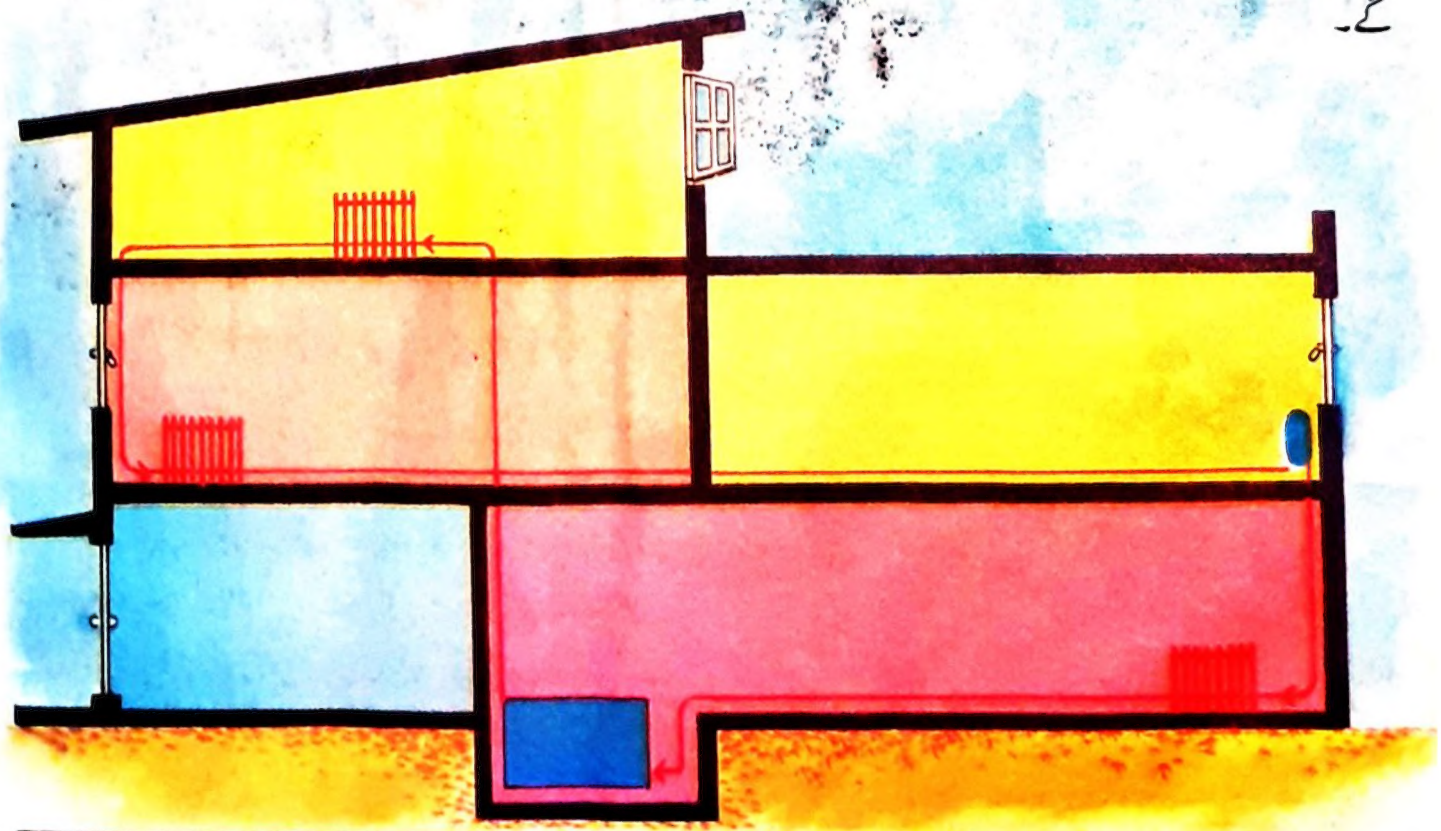

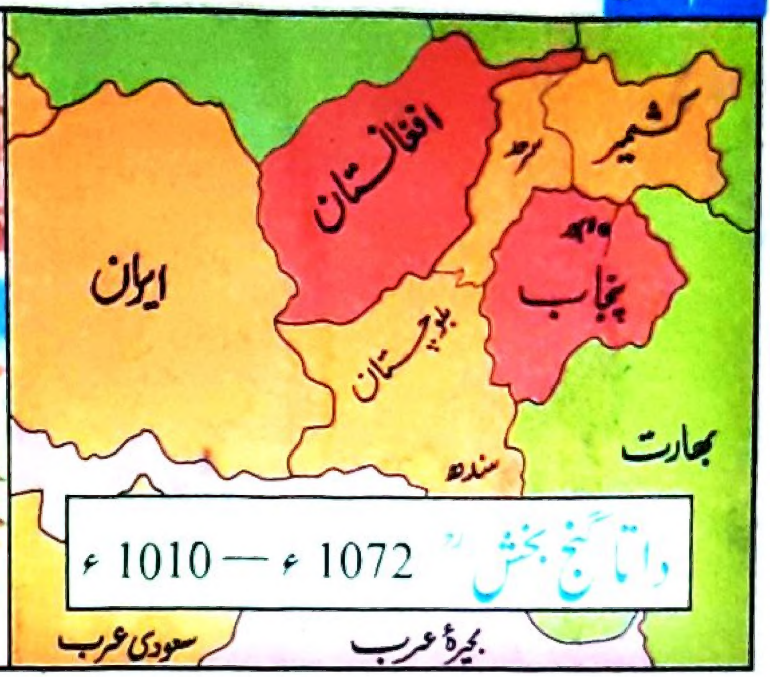

پاکستان اور ہندوستان میں جن بزرگوں نے پہلے پہل اسلام کی شمع روشن کی اُن میں حضرت داتا گنج بخش ؒ کا نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ آپ ایسے وقت میں یہاں تشریف لائے جب کہ پنجاب اور صوبہ سرحد میں مسلمانوں کی حکومت قائم ہو چکی تھی لیکن آبادی ہندوؤں کی تھی۔ آپ کی ہدایت پر بے شمار ہندوؤں نے مذہب اسلام قبول کر لیا۔

آپ کا پورا نام شیخ ابوالحسن علی ہجویری ؒ ہے۔ آپ قریباً 1010ء میں سلطان محمود غزنوی کے عہد میں افغانستان کے مشہور شہر غزنی کی ہجویر نام کی ایک بستی میں ایک درویش شیخ عثمان ابنِ علی کے گھر پیدا ہوئے۔ آپ نے اپنی ابتدائی تعلیم اپنے گھر میں اپنے والد اور شہر کے دیگر علما سے حاصل کی۔ بعد میں اپنے عہد کے مشہور بزرگ شیخ ابوالفضل محمد بن الحسن الختلی سے بیعت کر لی اور صوفیانہ زندگی اختیار کر لی۔ آپ نے اپنی تمام عمر علم حاصل کرنے اور لوگوں کو وعظ و نصیحت کرنے میں صرف کر دی۔ اس سلسلے میں آپ نے افغانستان اور پاکستان و ہندوستان کے علاوہ کرمان، سیستان، ترکستان، ایران، عراق، شام، فلسطین تک سفر کیا۔ اس کے علاوہ حج اور حضور ؐ کے روضۂ مبارک کی زیارت کے لئے کئی دفعہ سرزمینِ حجاز کا سفر بھی کیا۔

اسی دوران میں جب پنجاب کے صوبہ لاہور میں غزنوی حکومت قائم ہو گئی تو آپ نے یہاں کے لوگوں کی ہدایت کے لئے کئی ایک سفر کئے۔ یہ انہی بزرگوں کی تبلیغ کا نتیجہ ہے کہ آج پاکستان میں اسلام کا بول بالا ہے۔ اس سے یہ بات بھی ثابت ہو جاتی ہے کہ اسلام تلوار کے زور سے نہیں بلکہ درویشوں اور صوفیوں کی ہدایت کے ذریعے پھیلا ہے۔

آپ پہلے پہل 1039ء میں لاہور پہنچے اور پھر یہیں کے ہو رہے۔ یہاں آپ نے اپنی زندگی خدا کی عبادت اور خدا کے بندوں کی ہدایت اور خدمت کرنے میں گزار دی۔ آپ نے قریباً 1072ء میں لاہور میں ہی وفات پائی اور یہاں آج بھی آپ کا مزار لوگوں کی روح کی تسکین کا باعث ہے۔

صوفی طریقے کے بارے میں آپ نے کئی ایک کتابیں تصنیف کیں، لیکن ان میں آپ کی مشہور تصنیف "کشف المحجوب" کو ایک بلند مقام حاصل ہے۔ یہ کتاب دنیا کی کئی ایک بڑی بڑی زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہے اور صوفی طریقے کی تعلیم کے سلسلے میں اسے بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ آپ کا قول ہے کہ علم حاصل کرنے کے لئے عمل اور عقل دونوں کی ضرورت ہے۔ آپ کا کہنا ہے کہ انسان جاہلوں کی صحبت سے بھی اس طرح فائدہ اٹھا سکتا ہے کہ ان کی جو بات اچھی نہ لگے خود اس سے باز رہے۔

عین الحق فرید کوٹی

The Taleem-o-Tarbiat, Lahore
R. L. No. 4756
ISSN 969 0039 9175 PAKISTAN'S MOST WIDELY READ URDU MAGAZINE FOR CHILDREN OF ALL AGES
Price Rs. 9.00

پاکستان اور ہندوستان میں جن بزرگوں نے پہلے پہل اسلام کی شمع روشن کی اُن میں حضرت داتا گنج بخش " کا نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ آپ ایسے وقت میں یہاں تشریف لائے جب کہ پنجاب اور صوبہ سرحد میں مسلمانوں کی حکومت قائم ہو چکی تھی لیکن آبادی ہندوؤں کی تھی۔ آپ کی ہدایت پر بے شمار ہندوؤں نے مذہبِ اسلام قبول کر لیا۔

آپ کا پورا نام شیخ ابوالحسن علی ہجویری " ہے۔ آپ قریباً 1010 ء میں سلطان محمود ... کے عہد میں ... میں ایک

... ہے۔ ... کہ اسلام تلوار کے زور سے ... ہدایت کے ذریعے پھیلا ہے۔

آپ پہلے پہل 1039 ء میں لاہور پہنچے ... رہے۔ یہاں آپ نے اپنی زندگی خدا کی عبادت اور خدا ... بندوں کی ہدایت اور خدمت کرنے میں گزار دی۔ آپ نے قریباً 1072 ء میں ... وفات پائی اور یہاں آج بھی آپ کا ... ہے۔

... کئی ایک کتابیں ...

صحت مند ادب

قوم کی ذہنی نشوونما کے لیے بچوں میں صحت مند ادب کو فروغ دینا ازبس ضروری ہے۔ یہ کتابیں آپ کے ہونہار بچوں کو دین اور دنیا کے تقاضے سمجھانے اور ان کی تخلیقی صلاحیتوں کو پروان چڑھانے کے لیے سپردِ قلم کی گئی ہیں۔ ان کتابوں میں اخلاقیات کے اسباق بھی ملتے ہیں اور ہماری تاریخ کی نامور شخصیات کو بہترین انداز میں متعارف بھی کروایا گیا ہے۔

ہدایات برائے آرڈرز :

سندھ اور بلوچستان پہلی منزل، مہران ہائیٹس، مین کلفٹن روڈ۔ کراچی فون : 570527 570534-537730

پنجاب 60 شاہراہ قائدِ اعظم ؒ۔ لاہور 301196-98

صوبہ سرحد، اسلام آباد، آزاد کشمیر اور قبائلی علاقے 277 پشاور روڈ۔ راولپنڈی 63503-64273

فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ
لاہور ۔ راولپنڈی ۔ کراچی